www.novelsclubb.com
اجی سنتے ہو
فائزہ افتخار
Pdf available at
www novelsclubb com
FB INSTA
novelsclubb

السلام علیکم

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری، ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842

اجی سنتے ہو!

از

فائزہ افتخار

www.novelsclubb.com

فائزہ افتخار

digest novels lovers group

نیم تاریک کمرے کے اس کونے میں جہاں فرانسیسی طرز کی بڑی سی کھڑکی کھلتی تھی۔ اور وہ کھڑکی اس وقت اگرچہ بند تھی اور اس پہ سفید جالی اور آسمانی ویلوٹ کے خوبصورت پردے گرے ہوئے تھے مگر گرمیوں کی اس صبح نے اپنی روشنیاں اس طرح منہ زور کر رکھی تھیں کہ موٹے شیشے کی کھڑکی' اس پہ لگے ویلوٹ کے بھاری پردے اور لہراتی سفید مہین جالی بھی اس کا راستہ پوری طرح نہیں روک پا رہی تھی اور یہ کونا کمرے کے نیم تاریک ماحول سے الگ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی جانب کروٹ لیے سویا ہوا تھا' یہی وجہ ہے کہ روشنی کا احساس مجھے بیدار کر گیا۔ میں نے سنبل کا نرم ملائم تکیہ چہرے پہ رکھا اور کروٹ بدل کے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ اے سی آف تھا مگر رات کے کئی گھنٹے مسلسل چلنے کی وجہ سے ابھی تک کمرے میں خنکی باقی تھی۔ پنکھے کی ہلکی بے آواز ہوا بھی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے ذرا سی آنکھ کھول کے سائیڈ

ناولٹ

ٹیبل پہ رکھے کلاک پہ توجہ کی۔ صبح کے پونے نو ہو رہے تھے۔ گرمیوں کے لحاظ سے دن کب کا شروع ہو چکا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ اگرچہ آج چھٹی کا دن تھا لیکن بارہ بجے میرا ایک پبلشر سے ملنا طے تھا بلکہ میں نے اسے لنچ پہ گھر بلا رکھا تھا۔ سست قدموں کے ساتھ میں کھڑکی کی جانب بڑھا۔ پردے کھینچے اور پورا بیڈ روم بغیر ٹیوب لائٹ آن کیے روشن ہو گیا۔ میرے اس مختصر مگر خوبصورت گھر کے دونوں بیڈ روم اوپر والے پورشن میں تھے اور اس رخ پہ بنے تھے کہ تازہ ہوا اور روشنی کا با آسانی گزر ہوتا تھا۔ یہ اہتمام میں نے بطور خاص اپنے شاعرانہ ذوق کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔

جی ہاں' میں ایک شاعر ہوں۔

نہ صرف شاعر بلکہ افسانہ نگار اور کالم نویس بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ایک کثیر الاشاعت روزنامے

کے ادبی و سماجی ایڈیشن کا انچارج بھی ہوں۔ میرے کئی شاعری کے اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور بے حد مقبول بھی ہو رہے ہیں۔ یہ اندازہ آپ کو میری مناسب حد تک خوشحال زندگی کو دیکھ کر بھی ہو سکتا ہے' ورنہ محض ادب کے سہارے کون معاشرے میں باعزت طور پہ رہ سکتا ہے۔ میرے دو شعری مجموعے تو نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہوئے' تقریباً" ہر سال ان کے ـــ نئے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مجھے نئے سرے سے رائلٹی ملتی ہے۔ نوجوان نسل مجھے محبت کا شاعر کہتی ہے۔ محبت' حسن' بہار... یہ سب میری شاعری کی علامات ہیں۔ میری اس مقبولیت کو کیش کرانے کے لیے پہلے پہل اس روزنامے نے مجھے کالم لکھنے کی آفر دی جسے میں نے منہ مانگی قیمت پر منظور کیا۔ میرے کالم سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور میں سیاسی موضوعات کے بجائے عام سماجی مسائل کے بارے میں حساس اور دردمند دلوں کو جھنجوڑنے کی نیت سے لکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتی حکومتیں اور اپنے اپنے مزاج کے مالک اہلِ اقتدار میرے کام میں خلل نہ ڈال سکے۔

اس میدان میں میری کامیابی دیکھتے ہوئے اس اخبار کے ایڈیٹر نے ہفتہ وار شائع ہونے والے سنڈے میگزین کے ادبی اور سماجی صفحات کا بھی مجھے انچارج بنا دیا۔ یعنی میرا رزق اس شعبے میں بڑھتا چلا گیا جس کے لیے میرے والدین جب تک حیات رہے' مجھے خوف زدہ ہی کرتے رہے کہ صرف کاغذ کالے کر لینے سے گھر کا چولہا نہیں جلتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری صلاحیت' میرا فن' میرے روزگار کا بھی سبب بنا۔ ذرا دیر سے ہی سہی مگر میں فکرِ معاش سے قدرے آزاد تو ہوا۔ اسی رزق سے میں نے یہ پانچ مرلے کا گھر اس متوسط مگر نئی ہاؤسنگ اسکیم میں بنایا۔ اسی کمائی سے خریدی گئی یہ سیکنڈ ہینڈ سوزوکی الف ایکس بھی گھر کے مختصر سے پورچ میں سیاہ کپڑے سے ڈھکی کھڑی ہے۔ مجھے آفس کی وین پک اینڈ ڈراپ کرتی ہے۔ میری بیٹی اپنی اسکول وین میں آتی جاتی ہے اور بیٹے کے پاس سائیکل ہے' اس لیے اس عمر رسیدہ گاڑی کی صحت بھی بہتر ہی رہتی ہے کیونکہ اس عمر میں ہم اس سے زیادہ کام جو نہیں لیتے۔

میں نے بھرپور انگڑائی لے کر اپنے اس پرسکون کمرے کا جائزہ لیا۔ نیلگوں ماحول ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ اپنے لیے بیڈ روم سجاتے ہوئے میں نے یہی رنگ نمایاں رکھا۔ دیواروں پہ ہلکا آسمانی پینٹ' دروازے اور کھڑکیاں سفید' فرش پہ گہرا نیلا کارپٹ اور اس سے ہم رنگ پردے' سفید فرنیچر پہ نیلے رنگوں کے امتزاج والی چادریں بچھی ہوتیں۔ یہ کمرہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا اور میری حسِ جمال کی تسکین کرتا تھا۔ یہی میرا اسٹڈی روم تھا۔ ویسے بھی اس مکان میں الگ اسٹڈی روم بنانے کی گنجائش نہ تھی۔ نچلے پورشن میں لاؤنج' ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم اور کچن تھا۔ ان کے اوپر دو کمرے بمع باتھ اور ایک اسٹور روم بنا ہوا تھا۔ اسٹور روم دونوں کمروں کے درمیان واقع ہے' اس طرح دوسرے کمرے کا شور میرے کمرے تک نہیں پہنچتا۔ وہ کمرہ میرے بچوں کا ہے' میری تیرہ سالہ بیٹی اور گیارہ سالہ بیٹے کا۔

میں نے کھڑکی کا شیشہ پورا کھول دیا۔ اگرچہ بڑی روشن صبح تھی مگر دھوپ اتنی تیز نہ نکلی تھی کہ بدن کو چبھتی۔ باہر کشادہ گلی میں میرا بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ یہ گلی آگے سے بند تھی۔ ٹریفک کا گزر نہ ہونا تھا' اس لیے اس میں بنے چھ سات مکان اس گلی کو مشترکہ طور پہ ایک پلے گراؤنڈ کی طرح استعمال کرتے تھے۔

پورچ کے ساتھ مختصر سا احاطہ تھا جس میں لگے دو پیڑ' ایک جامن کا اور ایک کچنار کا... گلاب اور موتیا کی باڑھ ـــ اور سائیڈ پہ پڑے دو چار گملے اس کو لان کی شکل دے رہے تھے' ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان گنتی کے چار گملوں' دو پیڑوں نے اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی تھی کہ اس "لان" میں دو بید کی کرسیاں ہی ڈال دی

جائیں۔ میری بیٹی جاناں گھاس پہ بیٹھی اپنا ڈرائنگ کا شوق پورا کر رہی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا تو مجھے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا۔

"پاپا!" وہ چلائی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"اسے پتا چل گیا کہ میں جاگ چکا ہوں۔" خوف زدہ ہوتے ہوئے میں نے سوچا اور کھڑکی کے آگے سے ہٹ گیا۔ میں اپنی بیٹی سے ہرگز خوف زدہ نہ تھا۔ وہ تو بچپن میں بھی کوئی تنگ کرنے والی بچی نہ تھی اور اب تو ماشاءاللہ سمجھ دار ہو چکی تھی۔ ہر وقت اپنی کتابوں، کلر پینسلز میں گم رہنے والی پڑھاکو سی عینکو بچی۔ (مجھے اپنی اولاد کے "عینکو" یا "چشما ٹو" ہونے پہ بڑا فخر تھا پتا چلتا تھا کہ کسی دانشور کی اولاد ہے۔) خوف تو مجھے اس لیے محسوس ہوا تھا کہ جاناں کی یہ آواز اس کھڑکی سے اندر تک بھی پہنچ گئی ہوگی جو کھڑکی ایک جانب سے اسی برائے نام لان میں اور دوسری جانب کچن میں کھلتی ہے اور جہاں میری بیوی آٹے میں دونوں ہاتھ گھمائے پراٹھے میں مکے مار رہی ہوگی۔ ڈھیر سارا ساگ اطراف میں پھیلائے زمین پہ پھسکڑا مارے ڈنڈیاں توڑ رہی ہوگی۔ کریلوں کو نمک مل مل کے خوب رگڑ رہی ہوگی یا پھر ایسی ہی کسی نامعقول مصروفیت میں مگن ہوگی لیکن میرے جاگنے کی اطلاع سن کر وہ پہلی فرصت میں ہاتھ اپنے بدرنگ سوٹ سے پونچھے گی۔ منہ پہ گری لٹوں کو ان ہی ہاتھوں سے دوبارہ اپنی اجڑی ہوئی چوٹی میں اڑسے گی اور بچا کھچا آٹا، ساگ کے پتے یا کریلے کی کڑوی جھاگ اپنی زلفوں میں سجائے سیڑھیاں دھڑادھڑ چڑھنا شروع ہو جائے گی۔ ایک دھماکے کے ساتھ میرے کمرے کا دروازہ کھولے گی اور اپنی بطخ جیسی کرخت آواز میں خوامخواہ کی شیرینی گھولنے کی سراسر ناکام کوشش کرتے ہوئے کہے گی۔

"اجی سنتے ہو!"

"اور میں۔۔۔ ریحان علی فلک۔۔۔ رومانوی شاعر، فکر انگیز کالم نویس، مایہ ناز دانشور، ایک سنجیدہ افسانہ نگار۔۔۔ ہرگز نہ سننا چاہتا تھا، کبھی بھی نہیں، ان پندرہ سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔۔۔ لیکن وہ میری بیوی۔۔۔ ایک رومانوی شاعر، حساس ادیب، ملک کی نامور ادبی شخصیت کی بیوی مجھ سے اجازت طلب نہیں کرتی تھی بلکہ مجھے خبردار کرتی تھی یہ کہہ کر۔

"اجی سنتے ہو!"

اسے اس بات سے قطعاً" سروکار نہ تھا کہ اس کا "اجی" سننے پہ رضامند ہے یا نہیں۔ وہ سننے کی تاب بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اسے صرف اپنی سنانے سے غرض ہوتی تھی۔

سیڑھیوں پہ اس کے چڑھنے کی دھمک گونج رہی ہے، اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہو، اپنی بے سروپا گفتگو کے ساتھ۔ میں واش روم میں پناہ لے لیتا ہوں۔

"دھڑام۔۔۔ ٹھاہ۔۔۔"

یہ دھڑام کی آواز میرے واش روم کا دروازہ بند ہونے کی تھی اور ٹھاہ کی زوردار آواز کے ساتھ میری بیوی نے دروازہ کھولا تھا۔

"اجی سنتے ہو!"

اس کی ریل گاڑی کی نصف صدی پرانی وسل جیسی آواز خالی کمرے میں گونج کے رہ گئی۔ اچانک میری رائٹنگ چیئر کے کراہنے کی آواز آئی اور پھر مسلسل آہ و بکا کی صورت مجھ تک پہنچتی رہی۔ یقیناً" وہ اس پہ بیٹھی گول گول چکر گھماتی جھولا جھول رہی ہوگی۔ میں نے غصے سے دانت کچکچائے مگر نتیجتاً ٹوتھ برش کا پیڑہ غرق ہو گیا جو دونوں داڑھوں کے درمیان کچلا گیا تھا۔ یہ اس مہینے کا چوتھا ٹوتھ برش تھا۔ پتا نہیں دانت کچکچانے سے پہلے میں یہ برش احتیاط سے نکال کیوں نہیں لیتا اور پتا نہیں، میں یہ دانت آخر کچکچاتا ہی کیوں ہوں اور پتا نہیں اس ٹوتھ برش کے بجائے میری بیوی سالم کی سالم کیوں نہیں، میرے دانتوں کی زد میں آکر کچلی جاتی۔

اوہو، یہ میں کیا اول جلول سوچ رہا ہوں۔ سراسر غیر شاعرانہ باتیں۔۔۔ نہیں، مجھ جیسے نفیس طبع رومانوی شاعر کو ایسے غیر رومانوی خیالات زیب نہیں دیتے۔

میں نے سر جھٹکا۔ واش روم میں اس سے زیادہ

وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا اور وہ بھی اس گرمی میں۔
میں نے چھت کا جائزہ لیا' مختصر سی کھڑکی میں ایگزاسٹ فین تو لگا ہی ہوا تھا۔ میں سنجیدگی سے سیلنگ فین لگوانے کے امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا۔
"چلو' اب آ بھی جاؤ۔ میں کوئی "ویلی" تو نہیں بیٹھی۔ روٹی پکا رہی ہوں' ہانڈی سڑنہ جائے۔"
اس کی دہائی پہ میں باہر نکلا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری باتیں وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینے کی عادی ہے' میں ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔
"ہانڈی نہیں' ہنڈیا کہتے ہیں اور یہ "سڑتی" نہیں "جل جاتی" ہے۔" ابھی تو میں اسے یہ بھی بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ "کھانا پکانے" کے بجائے "روٹی پکانا" کیوں کہتی ہے کہ اس نے اپنے اصل منہ سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔
"سڑے۔۔۔ یا جلے۔۔۔ ایک ہی بات ہے۔ ناس تو ہو جاتی ہے۔"
"ناس کیا ہوتا ہے' ضائع ہو جاتی ہے یا برباد ہو جاتی ہے۔" میں اردو کی اس مرمت پہ رہ نہ پایا تھا۔
"ناس ہو' برباد ہو' ضائع ہو' تباہ ہو' ایک ہی بات ہے۔ سیاپا تو میری جان کو ہے' مجھے ہی دوبارہ وخت پڑے گا۔"
اس سے پہلے کہ میں "سیاپا" اور "وخت" کے متبادل کوئی مہذب اور بھلے الفاظ اسے بتاتا کہ وہ شروع ہو گئی۔
"اجی سنتے ہو! آپاں صغراں کی پوتری (پوتی) کی کڑمائی ہو گئی ہے۔"
"کیا۔۔۔ کیا ہو گئی ہے۔" جہاں تک میرے علم میں تھا' میری اس رشتے کی خالہ جو خاندان میں آپا کے نام سے مشہور تھیں' کی کسی پوتی کی اب تک شادی نہ ہوئی تھی پھر ان کی "کڑمائی" کیسے ہو گئی۔"
"کس کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے؟"
"ہا۔۔۔ ہائے۔ اجی' ہوش کرو' ابھی تک سوئے ہوئے ہو۔ میں نے بیٹی کا نام کب لیا۔ آپاں کی سب سے سیانی پوتری کی کڑمائی ہو گئی ہے۔ یعنی بات پکی ہو گئی ہے۔
"اوہ۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ مبارک ہو۔"
"مجھے کس بات کی مبارک باد۔ لو بھلا' تو کون میں خوامخواہ۔" وہ بلاوجہ ناراض ہو گئی۔ میں نے کھڑکی سے آواز دے کر جاناں کو اخبار لانے کے لیے کہا۔
"بڑی آپاں بنی پھرتی ہیں' آپ کو بڑا شوق ہے اپنے گھر کے ہر معاملے میں اپنی خالہ کو آگے کرنے کا۔ بزرگ ہیں ہماری' بزرگ ہیں ہماری۔" اس نے ٹیڑھا منہ کر کے میری نقل اتاری۔ میں غصے کا گھونٹ بھر کے رہ گیا۔ بے شک یہ الفاظ میں نے ضرور ادا کیے ہوں گے مگر ایسے منحوس تاثرات کے ساتھ نہیں جیسے کہ وہ کہہ رہی تھی۔
"انہیں شرم نہ آئی' اتنا بڑا فیصلہ آپوں آپ کرتے ہوئے۔ آپ سے صلاح نہیں لے سکتے تھے۔ سارے معاملے طے کر کے یہ چار لڈو پکڑا گئے ہیں۔" اس نے موتی چور کے لڈو سامنے کیے۔ میں نے اخبار کے استقبال کی خاطر عینک چڑھالی۔
"لڈو کے ساتھ چائے بھی لے آتیں۔" میں نے احساس دلایا کہ ساڑھے نو بج رہے ہیں اور میں تاحال صبح کی اس عیاشی سے محروم ہوں۔
"پاپا! چائے اور یہ اخبار۔" جاناں نے گرم گرم چائے کا کپ آگے کیا تو میں سمجھ گیا کہ اسے اخبار لانے میں تاخیر کیوں ہوئی' ورنہ وہ میری ایک آواز پہ لپک کے آجایا کرتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کپ تھاما اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک پیار بھرا بوسہ دیا۔ وہ مجھ سے جڑ کے بیٹھ گئی۔ آرزو کو ہماری محبت کا یہ مظاہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ایک آنکھ بھی مجھے نہ بھاتی تھی۔ (آرزو میری بیوی کا نام ہے اور اس نام پہ میں نے جو دھوکے کھائے ہیں اور میری آرزوؤں کا جو قتل عام ہوا ہے' اس کے دکھڑے میں بعد میں روؤں گا۔ ذرا چائے' لڈو اور اخبار سے نمٹ لوں اور ہاں۔۔۔ آرزو کی بے تکی باتوں سے بھی۔)
"کتنی بار کہا ہے' بیٹیوں کے ہاتھ نہیں چومتے۔

ان کے ماتھے پہ پیار کرتے ہیں۔" اس کے اعتراض کی وجہ آج ہر حال میں جاننے کی ٹھانتے ہوئے میں نے "کیوں" کا نعرہ بلند کیا۔

"سیانے کہتے ہیں۔ بیٹی کے ماتھے پہ پیار کرو تو اس کے نصیب اچھے ہوتے ہیں' ہاتھ پہ پیار کرو تو ہاتھ میں ذائقہ نہیں رہتا۔" اس نے اپنی علمیت جھاڑی۔ ایسے میں اس کے ہونق چہرے پہ جو خود ساختہ "سیانا پن" ہوتا تھا' وہ دوسروں کے قہقہے بلند کرنے میں خاصا معاون ثابت ہوتا۔

"اس سیانے نے یہ مشورہ تمہارے اباجی کو کیوں نہ دیا۔ وہ بھی ضرور تمہارے ہاتھ چومتے رہے ہوں گے۔" میرے طنز کی تہ میں اترے بغیر اس نے جواب دیا۔ "میرے اباجی آپ بڑے سیانے تھے' وہ خود یہ بات کہتے تھے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ یعنی یہ ان کا تجربہ بول رہا تھا۔" وہ اب بھی نہ سمجھی مگر میری دبی دبی مسکراہٹ اور جاناں کی کھی کھی سے ذرا مشکوک ہوئی۔

"چلو چھوڑو۔ اجی سنتے ہو! میں نے کہا۔ آپاں صغراں کو مبارک باد دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ فون کرنا ہے' نہ گھر جانا ہے۔ ذرا آگ لگنے دو ان کو بھی' جب پوچھیں گی تو جتائیں گے کہ ہم اس بچی کے کوئی نہیں لگتے جو کسی صلاح مشورے میں شامل نہیں کیا۔"

میں نے اس کے مشورے پہ فوراً" سر ہلا دیا۔ میں یکسوئی سے اخبار پڑھنا چاہتا تھا' اس لیے اس کے جانے کا منتظر تھا۔

"آج کیا پکاؤں؟"

جس سوال سے میں بچنا چاہ رہا تھا' وہی اس نے سامنے لا رکھا۔ اب ہر روز کی طرح ایک بحث شروع ہونے والی تھی جس کے سارے مندرجات سے میں آگاہ تھا۔ اپنے پیش کیے گئے نکات سے بھی اور اس کے اعتراضات سے بھی۔ اس بحث کا منطقی انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی جانتا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ اس بحث سے فرار ممکن نہیں۔ میں نے ایک بے بس سی آہ بھری۔

"جو مرضی پکالو۔" روز یہ جملے دہرا دہرا کے اب میں خود ہی تنگ آگیا تھا۔

"میری مرضی کا آپ نے کوئی کھانا ہے۔ ویسے بھی چھٹی کا دن ہے' کھانا آپ کی پسند کا پکنا چاہیے۔" وہ البتہ یہی فقرے ہر بار بڑی رغبت سے ادا کرتی تھی۔

"بچوں سے پوچھ لو۔" وہی میرا جان چھڑانا۔

"بچوں سے کیا پوچھوں۔ جاناں کہے گی۔ ماما! میں نے ابھی اتنا بڑا پراٹھا کھایا ہے' میں تو رات تک کچھ کھانے والی نہیں۔ جنید کہے گا۔ میرے لیے برگر یا پزا منگوا دیں۔" وہی اس کا جان نہ بخشنا۔

"گوشت میں کوئی سی بھی سبزی ڈال لو۔" میں نے اخبار پلٹا۔

"مگر کون سی' کوئی ایک سبزی ہے۔"

"کدو ڈال لو یا بھنڈی۔"

"گوشت اتنا مہنگا ہو گیا ہے' دو سو روپے کلو۔ ناس مارنا ہے اتنے مہنگے گوشت کا۔" وہ غضب ناک ہوئی۔

"بھنڈی تو بندہ ویسے ہی مسالہ ڈال کے بھون لے۔ گوشت میں تو ساری لیس چھوڑ دیتی ہے اور کدو تو ابھی کل ڈالے تھے۔"

"آلو ڈال لو' کچنار ڈال لو یا پھر ایسے ہی بھون لو۔"

"دماغ خراب ہے میرا جو اتنا مہنگا گوشت خالی بھون لوں۔ ایک ڈونگا بھی نہیں بنے گا۔ سبزی سے دو وقت کا سالن بن جائے گا۔ آلو آج کل میٹھے آرہے ہیں اور کچنار کا اب موسم کہاں رہا ہے۔ جب موسم تھا تو آپ نے پکانے نہیں دی کہ پکانے کے لیے سبزیاں کم تو نہیں جو کچی کلیاں نوچ کر پکا رہی ہو' کم از کم پھولوں کو تو بخش دو۔"

"ہاں تو کیا غلط کہا تھا۔ اتنی نرم و نازک کونپلوں کو گھی میں گرم مسالے اور دہی کے ساتھ پکتے دیکھ کر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔"

"اور کیا مجھے تکلیف نہیں ہوتی تھی جب نوکریاں بھر بھر کچنار اپنے درخت سے اترتی تھی اور محلے والے چٹخارے لے لے کر کھاتے تھے۔ چالیس روپے کلو

ملتی ہے بازار میں اور ہم مفت کی بھی نہیں کھا سکے۔ ہائے، آج تو آپ کا دوست بھی کھانے پہ آرہا ہے۔ جلدی بتائیں۔ کیا پکانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے' ابھی مجھے اتوار بازار بھی جانا ہے۔ سیل سے لان کے "ٹوٹے" (پیس) بھی چھانٹنے ہیں۔"

"مرغی سستی ہے' وہ بھون لو۔ ساتھ میں مسالے والی بھنڈی۔"

"آپ کا دوست کیا کہے گا' فون کر کے روٹی پہ بلایا اور یہ پکا کر رکھ دیا۔"

"پھر مرغی کی بریانی یا پلاؤ بنالو۔ ساتھ میں شامی کباب' ایک سالن بنا ڈالو۔"

"ہاں' بڑا لاٹ صاب آرہا ہے۔ میں ہزار روپے کی روٹی پکا ڈالوں۔" اس نے ہاتھ نچایا۔ زچ ہو کر میں نے اخبار پٹخ دیا۔

"تم کچھ مت پکاؤ' کم از کم میرے یا میرے دوست کے لیے تو ہرگز نہیں۔ میں اسے باہر کھانا کھلا دوں گا۔ "خیری صلا' گھر کے ہوتے ہوئے ہوٹل میں کس لیے جانا ہے اور اگر زیادہ نوٹ ابل رہے ہیں یاروں پہ لٹانے کے لیے تو ایک چکن کا جوڑا مجھے بھی لے دو۔"

"تم کھانا بعد میں پکانا' پہلے چکن کا جوڑا لے آؤ۔"

اس سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے اگر پانچ سو یا ہزار کے نوٹ کی قربانی دینا پڑتی تو مجھے منظور تھی۔

"پہلے آپ اٹھو' پوستی بن کے لیٹے رہتے ہو۔"

اس نے کمال جرأت سے ملک کے ایک عظیم مفکر اور دانشور کو "پوستی" کا خطاب دے دیا۔ میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا۔

"چکن کا جوڑا میں آپے خرید لوں گی۔ آپ پہلے کلو چکن خرید کے لاؤ۔ کیا یاد کرو گے' آج آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ چکن پلاؤ بنا لیتی ہوں' ورنہ میرا دل تو کڑھی کھانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے بیسن بھی گھول رکھا تھا۔ حیرت کی شدت سے میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا' ورنہ وہ ساری تیاریاں کرنے کے بعد رسماً" مجھ سے پوچھنے آیا کرتی اور ایک لایعنی بحث کے بعد آخر وہی پکاتی جو اس نے طے کر رکھا ہوتا تھا۔ اگرچہ دکانوں پہ سبزی یا گوشت خریدنا میرے شایان شان نہ تھا اور میں حتی الامکان اس سے گریز کیا کرتا تھا لیکن آج میں اس پہ بھی تیار ہو گیا۔ ویسے بھی اس متوسط علاقے میں رہنے کا فائدہ یہ تھا کہ مجھ سے نامور ادیب کو نام سے تو بہت سے لوگ پہچانتے تھے مگر صورت سے کم ہی.... پھر بھی ریڑھی والے سے ٹماٹروں کے بھاؤ پر بحث کرتے ہوئے میں کن اکھیوں سے دیکھتا رہتا کہ کہیں میرا کوئی نوجوان مداح مجھے اس "مذموم حرکت" میں ملوث پا تا نہ دیکھ لے۔ یہ بھی شکر تھا کہ کتابوں کی پشت پہ چھپنے والی میری تصویر کوئی اٹھارہ سال پرانی تھی۔

"اور ہاں' میں مذاق نہیں کر رہی۔ شام کو مجھے واقعی اتوار بازار جانا ہے۔ اپنے اور جاناں کے لیے لان کے "ٹوٹے" دیکھنے ہیں۔ ساتھ میں ایک نظر دوسری دکانوں پہ بھی مار لوں گی۔ آپاں صغراں کی پوتری کی شادی ہو گی۔ ظاہر ہے بڑھیا سا کامدار جوڑا اور ساتھ جہیز کے لیے تحفہ بھی دینا ہو گا۔ ابھی سے سوچ کے رکھ لوں' کیا لینا ہے اور کتنے میں آئے گا۔"

میں حیرت سے اپنی زوجہ محترمہ کو تکنے لگا جو کسی کرپٹ سیاستدان کی طرح منٹ منٹ میں بیان بدل رہی تھی۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ انہیں مبارک باد تک نہیں دینی۔" میں اس پینترے بازی کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔

"وہ الگ مسئلہ ہے مگر دھی تو سانجھی ہوتی ہے۔" وہ پھر سے "سیانا پن" جھاڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھ سے تھاما۔ عرصے سے اسی دماغ کی بدولت کھا رہا تھا۔ دماغی محنت کر رہا تھا۔ گھنٹوں لکھنے' طویل مقالے پڑھنے' عرق ریزی کرنے کے باوجود ذہنی حالت اتنی مخدوش نہ ہوتی تھی جتنی اس عورت کے ساتھ آدھ گھنٹے کی بحث میں ہو جاتی تھی۔

شاید دماغ کی گرمی تھی جو اچھا بھلا خوشگوار موسم بھی لو برساتا محسوس ہو رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ڈیڑھ

کلو مرغی کا گوشت' تازہ لہسن' پودینے کی گٹھی اور کلو دہی لے کر میں لوٹا۔ وہ صفائی والی ماسی پہ اپنی علمیت جھاڑ رہی تھی۔

"تاجی! مجھے نہیں پتا' زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ لوگوں کے اندر سے خوفِ خدا ختم ہو گیا ہے۔ دنیا تباہ ہو رہی ہے' سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

"ہیں باجی! تسی سچ آکھدے او؟" آخر کار وہ اس غریب مسکین عورت کو خوف زدہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ (زور کس پہ ہوا "بھی" پر۔)

"تو اور کیا۔ مجھے بھلا ان باتوں کا کیا پتا۔ تو ٹھہری سارا دن گھر گھر کام کرنے والی سیدھی سادی گنوار عورت۔ تجھے تو اخبار بھی پڑھنا نہیں آتا۔"

"تو باجی! آپ کو اخبار سے ساری باتیں پتا چلتی ہیں؟ یہ قیامت والی بھی۔" اس کے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"نہیں تاجی! یہ اخباروں والے۔۔۔ ہونہہ' انہیں "ککھ" پتا نہیں۔" اس نے ٹیڑھی نظر سے مجھے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر کہا۔ مجھے تاؤ آگیا۔

"تاجی! یہ سیڑھیوں کی صفائی کیوں نہیں کی اب تک۔ بارہ بج رہے ہیں اور تمہاری گپ شپ ہی ختم نہیں ہو رہی۔"

"بس صاب جی! کرنے لگی تھی۔ ذرا باجی سے بات کرنے لگ گئی۔"

"تمہاری باجی کو تو اللہ موقع دے باتوں کا۔ تم کیوں اس کی باتوں میں آکر اپنے کام میں کوتاہی کرتی ہو۔"

"لو صاب جی! باجی تو اتنی سیانی باتیں کرتی ہے۔ بندہ پاس بیٹھتا ہے تو کچھ سیکھتا ہی ہے۔ مجھے کیا خبر' دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ باجی کا اللہ بھلا کرے' مجھے ہر روز نئی بات بتا دیتی ہیں۔ مجھ جاہل کو بھی اب زمانے کی خبر ہو گئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں صاب جی! آپ بھی اپنی بیگم کے پاس بیٹھ کر چار باتیں علم والی سیکھ لیا کرو۔"

اس مشورے پہ مجھے جتنا غصہ آنا کم تھا۔ میں۔۔۔ یعنی کہ میں۔۔۔ ریحان علی فلک۔۔۔ ملک کا مشہور دانشور' کامیاب صحافی' ہر دل عزیز شاعر اور جانا مانا افسانہ نگار۔۔۔ اس دو من کی عورت سے علم حاصل کروں جس کا علم لان کے "ٹوٹوں" اور دیسی گھی کے "تڑکے" تک محدود تھا۔ میں نے ٹھوکر سے سیڑھی پہ رکھا پام کے پودے کا گملا گرا دیا۔

"ہائے توبہ۔۔۔ باجی! تیرا بندہ تو بڑا "ڈاڈا" (سخت) ہے۔" تاجی نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ میں دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ میری بیوی نے اپنے بارہ سیکھے کے چہرے کے تمام طول و عرض میں کمال درجے کی مظلومیت اور لاچاری بھر لی ہو گی۔ شاید اپنے جارجٹ کے پرانے دوپٹے کے اکڑے ہوئے پلو سے رگڑ کر اپنے ڈیلے سے چند آنسو بھی ٹپکا لیے ہوں۔ (اوہو' میرا مطلب ہے آنکھ سے۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ ڈیلا۔۔۔ یہ عورت میری زبان و بیان پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔)

"کیا کروں بہن۔" اس نے ہمدردی پا کر جھٹ اسے بہن بنا ڈالا۔ "مرد ذات ہے' سارا کچھ جائز ہے بھئی' ہائے بیچاری عورت۔"

اب اپنی قابل رشک یادداشت میں سے وہ عورت کی مظلومیت اور مرد کی حاکمیت کے ایسے ایسے دل خراش اور عبرت ناک قصے سنانے والی تھی کہ تاجی تو بلکنے لگ ہی جاتی۔ شاید میں بھی دھاڑیں مارنے لگ جاتا' اس لیے میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور غسل فرمانے تشریف لے گیا۔

ایک پبلشر جو میرا پرانا واقف کار تھا۔ میرے روزانہ چھپنے والے کالموں کے انتخاب کو کتابی شکل دینا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں' میں نے اسے گھر مدعو کیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد میں نیچے اترا اور دو گھنٹے تک ڈرائنگ روم میں مذاکرات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ کھانا لگنے کی اطلاع مل گئی۔

ٹیبل پہ پہنچ کر نئے سرے سے میرا خون کھول اٹھا۔ آج اس نے پلاؤ پہ عمل در آمد تو کر لیا تھا مگر اپنی پسند یعنی کڑھی سے بھی دستبردار نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت خوش رنگ خوشبو دار پلاؤ کے ساتھ کالے زیرے کے بگھار والی پیلی پیلی گاڑھی کڑھی کالبالب

بھراڈونگا بھی پوری شان اور طمطراق کے ساتھ براجمان تھا۔ اسی پہ بس نہ کرتے ہوئے اس نے بڑے ہی فخریہ انداز میں مٹی کی چھوٹی سی ہانڈی بھی لاکر درمیان میں رکھ دی جس میں دیسی گھی کے تڑکے والا بینگن کا بھرتا بہاریں دکھا رہا تھا۔

اس عجیب و غریب مینو والے لنچ کی وجہ سے میں نے اپنے معزز مہمان کے سامنے سخت شرمندگی محسوس کی۔ اس میں شک نہیں کہ آرزو کھانا ٹھیک ٹھاک بنا لیتی ہے اور یقیناً اس وقت ٹیبل پہ موجود تینوں پکوان ذائقے کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ لاجواب ہوں گے مگر اچھا پکا لینا ایک الگ بات ہے اور اچھی طرح پیش کرنا ایک سراسر الگ بات۔ اتنے سالوں میں کچن کو مورچہ بنا کر وہ مسالوں کے صحیح تناسب اور ذائقے کے بارے میں بے شک جان چکی ہے مگر اتنے عرصے سے جو میں اسے سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں' وہ سیکھنے پہ راضی نہیں۔ کیا چیز کب پکانی چاہیے' کس ڈش کے ساتھ کون سی ڈش پیش کرنی چاہیے۔ کس مہمان کے لیے کیسا کھانا پکانا چاہیے۔

اب آپ ہی بتائیے۔ کوئی شریف انسان مرغ پلاؤ پہ کڑھی انڈیل کر یا بھرتہ ڈال کر کھا سکتا ہے۔"

میں شاعر اس لیے نہیں بنا کہ مجھے شاعری کرنا آتی تھی بلکہ اس لیے کہ میں سوائے شاعر کے اور کچھ بن ہی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں شاعر بنا نہیں بلکہ بنا بنایا اس دنیا میں آیا۔

مجھے حسن' نزاکت اور نفاست ہمیشہ سے اپنی جانب کھینچتے تھے۔ چاہے وہ حسن کسی دلکش چہرے کا ہو یا کسی حساس دل کا۔۔۔ چاہے وہ نزاکت کسی دل رُبا کی اداؤں میں ہو یا کسی خوبصورت خیال میں۔۔۔ چاہے وہ نفاست کسی کی عادتوں میں موجود ہو یا میرے اردگرد کے ماحول میں۔۔۔ میری یہ حسن پرستی اور نفاست پسندی مجھے تنہا کرتی گئی۔

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ تین بھائیوں اور دو بہنوں کے بالکل درمیان میں۔ میرے والد ایک سیدھے سادے دکاندار ٹائپ آدمی تھے۔ تعلیم اس حد تک تھی کہ دکان کا سودا اور ادھار والوں کا حساب کتاب لکھ لیتے تھے۔ تینوں بھائیوں میں سے کوئی میٹرک سے آگے نہ بڑھا کیونکہ آگے بڑھنے کے لیے میٹرک پاس کرنا ضروری ہوتا ہے اور وہ ان تینوں میں سے کوئی نہ کر سکا۔

والدہ بچپن میں ہی گزر گئیں۔ (میرا مطلب ہے' میرے بچپن میں)۔ تین میں سے دو بھائیوں نے ابا کی زندگی میں ہی اپنا اپنا حصہ لے کر الگ بزنس شروع کر دیا۔ (دکانداری ان کے نزدیک بزنس ہی تھی)۔ ایک نے جوتوں کی دکان ڈالی۔ دوسرے نے ابا کی دیکھا دیکھی جنرل اسٹور کھولا۔ دونوں شادی بھی کر چکے تھے۔ خیر سے دونوں کی بیویاں جہالت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ تیسرے بھائی نے دبئی کا ٹکٹ کٹایا اور پھر ہو گیا۔ تینوں جلد ہی اپنی زندگی میں سیٹ ہو گئے۔ بڑے کی جوتیاں خوب چلنے لگیں اور جوتی کے زور پہ ہی اس نے اپنا مکان بھی خرید لیا۔ اب وہ ہفتے کے ہفتے آتا اور اس کی گہری سانولی بیوی پیلے پیلے سونے کے بدوضع موٹے کڑے لہراتے ہوئے نئی نئی سیکھی اردو بولنے کی کوشش کرتی۔

دوسرے کو غیرت آئی۔ اس نے بھی ملاوٹ' ذخیرہ اندوزی اور دو نمبر مال کے سہارے اپنا جنرل اسٹور وسیع کر لیا۔ اب اس میں آئس کریم والی مشین' فوٹو اسٹیٹ مشین اور پی سی او کا اضافہ بھی تھا۔ اس کی بیوی کی رنگت بے حد سفید تھی۔ وہ کشمیرن کیوں پیچھے رہتی سونے کی نمائش سے۔ سو اس کے موٹے موٹے بازوؤں کی چربی بھی سونے کی چوڑیوں میں پھنس یا دھنس گئی۔

دبئی والے نے وہاں ایک پاکستانی فیملی کی بیوہ سے شادی کر لی اور دونوں بڑے بھائیوں کی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے ڈرافٹ دونوں بہنوں کو شان سے بیاہ گئے۔ ابا جی سکون سے وفات پا گئے۔

صرف میں رہ گیا جو "اپ سیٹ" تھا۔ دراصل نہ میری تعلیم مکمل ہوئی' نہ شادی اب تک ہو سکی تھی'

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل

★ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے،
★ نئے بال اُگاتا ہے
★ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
★ مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید
★ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔
"سوہنی ہیئر آئل"
قیمت /60 روپے
12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے ایک شیشی کی قیمت صرف /60 روپے ہے دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں
ایک شیشی کے لیے ___ /80 روپے
2 شیشیوں کے لیے ___ /140 روپے
3 شیشیوں کے لیے ___ /210 روپے
نوٹ! اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں
منی آرڈر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:
بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ سیکنڈ فلور ایم اے جناح روڈ کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
• بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ سیکنڈ فلور ایم اے جناح روڈ، کراچی
• مکتبۂ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی فون نمبر 7735021

نہ ہی میری جوتوں یا نمک' مرچ والوں کی دکان زوروں پہ تھی۔ نتیجتاً میں ان کی نظروں میں ابھی تک سیٹ نہ ہو سکا تھا۔ بھابھیاں اپنی بہنیں میرے سر منڈھنے لگیں۔ بڑی بھابھی کی ان سے بھی کالی بہن' چھوٹی بھابھی کی ان سے بھی موٹی بہن۔۔۔ شکر ہے دبئی والی بھابھی کی کوئی بہن نہ تھی' ورنہ وہ ان سے بھی زیادہ ہوتی۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ میں بھی کس بے مقصد تمہید میں الجھ بیٹھا۔ سب اس عورت کی پندرہ سالہ رفاقت کا نتیجہ ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا' دونوں بھابھیوں کی بہنوں سے بمشکل اپنا بچاؤ کرتے ہوئے میں ان دنوں دو دو محاذوں پہ بیک وقت ڈٹا ہوا تھا۔ ایک محاذ تو اردو ایم اے کا تھا' دوسرا عشق کا۔ مجھے ڈگری یافتہ کہلانے کا شوق تھا لیکن یہ شوق صرف ایم اے اردو کی ڈگری لے کر ہی پورا ہو سکتا تھا جس کی ہمارے معاشرے میں گئی گزری سی حیثیت ہے اور یہ ڈگری اگر کسی ایسے "مرد" کے ہاتھ میں ہو جو اس کے بل بوتے پہ ملازمت حاصل کرنے کا خواہشمند ہو تو یہ حیثیت گئی گزری بھی نہیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ میں میرے علاوہ بس دو ہی اور لڑکے تھے اور ہم تینوں ڈیڑھ درجن لڑکیوں کے جھرمٹ میں جھینپے جھینپے ذرا حواس باختہ رہتے۔ (ویسے آپ اس "جھرمٹ" لفظ کو "نرغے میں" بھی پڑھ سکتے ہیں۔)

اور ان میں سے ایک لڑکی ایسی بھی تھی جسے سامنے پا کے میں معمول سے زیادہ جھینپا اور حواس باختہ لگا کرتا۔ وہ لڑکی تھی غزالہ درخشاں غزل۔۔۔ غزل اس کا تخلص تھا۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کے ادبی مجلہ میں اس کی غزلیں چھپتی رہتی تھیں جو سراسر میری مہربانی تھی کیونکہ میں اس زمانے میں اس مجلہ کا ایڈیٹر تھا اور شاعری کے افق پہ میرا نام دھیرے دھیرے نمایاں ہو رہا تھا۔ میں کئی مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ کالج کے بعد اب یہاں بھی لوگ مجھے ایک شاعر اور افسانہ نگار

کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ پہلے پہل وہ بھی اپنی ایک غزل کی تصحیح کے لیے میرے پاس آئی تھی اور میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس کو کن اکھیوں سے کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اتنے قریب سے اس کی جلوہ آرائی سے میرا عاشق مزاج اور حسن پرست دل حد درجہ متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اسم بامسمّٰی تھی۔۔۔ سراپا غزل تھی۔

اس کی بڑی بڑی حیران اور روشن آنکھیں' ان پہ سایہ فگن گھنیری خم دار پلکیں۔ سونے کی سی چمک لیے صاف گندمی رنگت جو صحت مندی کا گلال رخساروں اور نازک سے لبوں پہ لیے ہوئے تھی۔ اس کی آواز بھی بے حد کومل اور سُریلی تھی۔ جب وہ اپنی نو آموز غزل کے کچے پکے شعر اس سحر انگیز آواز میں سناتی تو سننے والے کا دھیان قافیہ اور ردیف کی کمزوریوں کی طرف جاتا ہی نہیں تھا۔ دھیان میں رکھنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔ اس کے نرم و نازک مصوّرانہ سے ہاتھ' مخروطی انگلیاں' پاکیزہ کی مینا کماری سے بھی زیادہ حسین پاؤں۔ صراحی دار گردن' گھنگھریالے شانوں سے بس ذرا سا نیچے آتے گہرے بھورے بال جو ریشم کے سنہری گچھوں کی صورت بکھرے رہتے۔ اس کی زلفوں کا پریشان رہنا اسے ایک مکمل شاعرہ کے طور پہ پیش کرتا تھا۔

اس کی باتیں بھی شاعرانہ ہی ہوتیں' دیگر لڑکیوں کی طرح اس کی گفتگو فیشن' شاپنگ اور ٹی وی پروگرامز تک ہی محدود نہیں رہتی تھی بلکہ وہ نامور مصنفین کی عالمانہ کتابوں پہ سیر حاصل تبصرے کیا کرتی۔ موسم کی رنگینی اور لطافت کے قصیدے انتہائی دلفریب انداز میں پڑھا کرتی۔ بے حد حساس شاعری اپنے منفرد لوچ دار لب و لہجہ میں یوں سنایا کرتی کہ جن شعراء کا وہ کلام ہوتا وہ اگر سن لیتے تو غزالہ کے نام منسوب کر دیتے۔

نہ صرف ادب اور گفتگو بلکہ لباس کے معاملے میں بھی اس کا ذوق قابل تحسین تھا۔ وہ موسم کی مناسبت سے رنگوں اور فیشن کے لحاظ سے اسٹائل کا انتخاب کیا کرتی۔ ہر رنگ اس پہ کھل اٹھتا تھا۔ ہماری دوستی جلد ہی محبت کے مرحلے طے کرنے لگی۔ ہم دونوں کی شاعری میں ہی درد اور بھی زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ شاید یہ ہمارے عشق کا اعجاز تھا۔ ادھر ہمارے ایگزامز ہونے والے تھے۔ ادھر میرے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت آخری مراحل میں تھی کہ اچانک غزالہ نے اپنی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر کے' اپنی کھنکتی آواز میں سوز بھر کے مجھے یہ منحوس خبر دی کہ اس کا رشتہ اس کے فرسٹ کزن سے طے ہو گیا ہے جو ناروے میں جاب کرتا ہے۔ یہ خبر مجھ پہ بجلی بن کر گری' میں اس کے آگے گڑگڑا اٹھا۔

"تم کو میری محبت کا واسطہ' بغاوت کر ڈالو' ہار مت مانو ظالم سماج کے سامنے۔ مجھے یہ جدائی ہرگز منظور نہیں۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔" میں نے اپنے تازہ ترین افسانے کے ڈائیلاگ سر پیٹ پیٹ کے دہرائے۔

"اور مجھے اپنی پاکیزہ محبت کی یہ رسوائی ہرگز منظور نہیں۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔" اس نے شبنم کی تازہ ترین فلم سے متاثر ہو کر عالمِ نزع والی ہچکیاں لیں۔

"میں ایک مشرقی لڑکی ہوں ریحان!" دوپٹے کا پلّو مروڑتے ہوئے خوابناک لہجے میں کہتی اب وہ شمیم آرا بنی ہوئی تھی۔

"میں اپنے والدین کے سامنے تمہارا نام کیسے لے سکتی ہوں۔ مجھے ان کی عزت بھی عزیز ہے۔ میں اپنا پیار قربان کر سکتی ہوں مگر ان کی عزت پہ حرف نہ آنے دوں گی۔" اس نے بابرہ شریف کی طرح پُرعزم لہجے میں کہا۔

(ان دنوں یہی مقبول اداکارائیں تھیں' کاش ہماری محبت آج کے دور میں پروان چڑھی ہوتی اور وہ ریما کی طرح گرج کے اعلان کرتی۔

تیری آن۔۔۔ لپیٹا پا لے۔۔۔ تیری آن۔۔۔"

یا صائمہ کی طرح گنڈاسہ اٹھا لیتی۔

"رب دی سوں' کڑی پنجابن تیری اے دلدارا۔"

مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا' وہ اسّی کی دھائی کے آخری سال

تھے۔ محبت میں تڑپ ضرور تھی مگر عشق ابھی اندھا نہ ہوا تھا۔ اسے ماں کے جوتے اور باپ کے ڈنڈے بند آنکھوں سے بھی بخوبی نظر آجاتے تھے۔)

"میں تم پہ الزام نہ آنے دوں گا۔ اپنی بھابیوں کو رشتہ لینے تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔" میں نے ایک اور شریفانہ کوشش کی۔

"مجھے صرف اپنے والدین کی ہی نہیں، تمہاری عزت بھی پیاری ہے۔ برا مت ماننا مگر تم کس بل بوتے پہ میرا رشتہ مانگو گے۔ تمہارے پاس نہ تو ملازمت ہے، نہ ہی جائیداد۔ میری خالہ کا بیٹا انجینئر ہے، ناروے میں ایک اعلا فرم میں ملازم ہے۔ میرے گھر والے اس کے مقابلے میں کبھی تمہارا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ وہ تمہاری بے عزتی کریں گے اور یہ میں برداشت نہ کرسکوں گی۔ میں زہر کھالوں گی۔"

"نہیں، تم زہر مت کھانا۔ میں تمہاری منگنی کے لڈو کھا لیتا ہوں۔" میں نے گلوگیر لہجے میں دل کڑا کر کے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کی گود میں رکھے ڈبے سے لڈو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ منہ میں میٹھا میٹھا لڈو۔۔۔ آنکھوں میں نمکین آنسو۔۔۔ واہ کیا رومانوی منظر تھا۔ اسی رات میں نے اپنی سب سے مقبول اور زبان زدعام ہوجانے والی نظم کہی۔

غزالہ اس روز کے بعد یونیورسٹی نہیں آئی۔ وہ امتحان بھی نہیں دے رہی تھی۔

"میں یہاں کیسے آسکتی ہوں، جہاں کے چپے چپے سے ہماری محبت کی یادیں وابستہ ہیں۔ ویسے بھی تعلیم تو کیا، اب مجھے زندگی سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بس جی رہے ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری اور آخری بار بھری۔ خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس آہ کے بعد اس کا دم نکل گیا بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل گئی۔ میری شاعری کو ہجر کا درد، میرے افسانوں کو جدائی کا غم دے کر۔

اس کے جانے کے تین دن بعد ہی اس کی ایک دوست نے بے حد دل جلے انداز میں مجھ پہ انکشاف کیا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں اس کی شادی زبردستی ہو رہی ہے۔ وہ ایسی لڑکی نہیں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ زبردستی کرسکے۔ اس کے اس کزن کے ساتھ اس کی منگنی آج سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی اور اس میں غزالہ کی مکمل پسند اور رضامندی شامل تھی بلکہ کالج کے دنوں میں وہ کلاسز چھوڑ کر اس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ وہ تو اس کا منگیتر اپنی جاب کے سلسلے میں بیرون ملک چلا گیا تو بوریت کے مارے۔۔۔ اور کچھ اپنی شاعری چھپوانے کے شوق میں وہ آپ سے دوستی کر بیٹھی۔"

اس نے مجھے استعمال کیا تھا، میری محبت کا مذاق اڑایا تھا اور مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ اس بات پہ پہلے تو میں اتنا دکھی ہوا کہ غزالہ کی اس "بھانڈہ پھوڑ" قسم کی دوست کے کیڑا لگے دانتوں اور مہاسوں بھرے رخساروں کی تعریف کر بیٹھا پھر اتنا شدید غصہ آیا کہ مارے غصے کے اسے "آئی لو یو" تک کہہ دیا۔

شکر ہے اور ہزار ہزار۔۔۔ لاکھ کروڑ دفعہ شکر ہے کہ نہ میں زیادہ دیر تک دکھی رہا، نہ غصہ میں رہا۔ ورنہ نجانے اور کتنی بار اس کی تعریف کرنی پڑتی، کتنی بار اسے "آئی لو یو" کہنا پڑتا۔ میں نے آنکھیں پھیر لیں۔

میرا رزلٹ آگیا تھا۔ ایم اے کا بھی اور پہلی کتاب کا بھی۔ کامیابی دونوں جانب سے ملی تھی۔ اگلے دو چار سال میں نے ادب کے میدان میں اپنی جگہ بنانے میں گزار دیے۔ ابتدا میں ماہانہ شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں قسط وار لمبے لمبے ناول لکھے پھر ادبی ساکھ والے رسائل میں بھی جگہ ملی۔ ابھی پہلے شعری مجموعے کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرا چھپ کر آگیا اور دھڑا دھڑ بکنے لگا۔ اب مجھ پر سے کم از کم بے کار اور بے روزگار انسان کی چھاپ اتر گئی۔ یعنی ہر زاویے سے میں اب ایک "لائق بیاہ" نوجوان تھا مگر بھابھیوں کی بہنیں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ اب انہیں میری شادی کی چنداں فکر نہ تھی۔ ایسے میں میری رشتے کی خالہ، آپا صغراں آگے آئیں۔ دو مہینے میں میرے لیے آٹھ رشتے لائیں۔ بھابھیاں تو پہلے ہی راضی تھیں۔ مجھے ہر کسی میں کوئی نہ کوئی اعتراض

مل جاتا۔ کئی ایک بار تو تصویر دیکھنے کی نوبت تک نہ آئی۔ مجھے لڑکی کا نام یا اس کے والد محترم کا پیشہ ہی پسند نہ آتا۔

"اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں ملک کا ابھرتا ہوا نامور شاعر' ایک نوجوان' باصلاحیت افسانہ نگار ریحان علی فلک کسی قصائی کی دختر نیک اختر سے بیاہ رچالوں جو میرے ہر شعر کو اپنے باپ کی طرح "ٹوکے" کے وار سے ذبح کردیا کرے گی اور یہ دوسری والی۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ کیا غیر شاعرانہ نام ہے اختر صابری۔ لگتا ہے کسی قوال سے شادی کررہا ہوں۔"

نواں رشتہ لے کر آپاں آئیں تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپاں! میرے لیے ان مڈل پاس اور میٹرک فیل لڑکیوں کے رشتے مت لایا کریں۔ لڑکی بے شک متوسط طبقے کی ہو' بھلے غریب گھر کی ہو مگر گھرانہ سلجھا ہوا ہونا چاہیے۔ باپ چاہے سرکاری اسکول کا غریب ماسٹر ہی کیوں نہ ہو۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہو' نرم مزاج' خوش ذوق' خوش گفتار اور مناسب حد تک خوش شکل بھی ہو۔" اب پتا نہیں میری شرائط آپاں کی سمجھ میں آئیں یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے کہا۔

"لڑکی پڑھی لکھی ہے چودھویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔"

"بی اے کا' اچھا اور گھرانہ؟" میں نے کچھ کچھ دلچسپی لی۔

"پیو تو ہے نہیں' ماں البتہ چٹی اَن پڑھ ہے۔ ویسے نماز' قرآن پڑھا ہوا ہے۔ بڑی عبادتن ہے۔"

مجھے لڑکی کی ماں کے اوصاف سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چاہے وہ "عبادتن" ہوتی یا "شوقن۔"

"دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ وڈا بھائی پولیس میں کانسٹیبل ہے' دوسرا ایک ڈاکٹر کا وہ ہے۔۔۔ وہ نہیں ہوتا جو پڑیوں میں دوائیاں لپیٹ کر دیتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ کمپاؤنڈر۔" مجھے کوائف کسی حد تک تسلی بخش لگے' ورنہ اس سے پہلے جو رشتے آتے' ان لڑکیوں کے والد حضرات یا قصائی ہوتے یا درزی۔ بھائی صاحبان بھی رکشہ ڈرائیور' سبزی فروش ہوتے تھے۔ مجھے ان کے پیشوں پہ اعتراض نہ تھا' نہ ہی ان کے اس روزگار کو برا سمجھتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میری خواہش تھی میری بیوی نہ صرف خود تعلیم یافتہ ہو بلکہ تعلیم یافتہ ماحول سے آئی ہو۔ چاہے اس کے بھائی یا باپ سرکاری افسر یا پروفیسر' ڈاکٹر' انجینئر نہ ہوں۔ معمولی پڑھے ہوں' سفید پوش ہوں۔

"نام آرزو ہے' گوری چٹی' اونچی لمبی' کالے سیاہ' لمبے بال' پاءپاء کی اکھ۔" آپاں نے مزید کوائف گنوائے۔ لڑکی کا نام آرزو مجھے اس قدر پسند آیا کہ اس کی آنکھ پاءپاء کے بجائے رتی' تولہ یا ماشہ برابر بھی ہوتی تو منظور تھا۔ بعد میں میرے پوچھنے پہ آپاں یہ خبر بھی لائیں کہ بی اے میں اس کے مضامین کیا تھے۔

ایک تو اسلامیات' دوسرا۔۔۔ کی کہتے ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ لٹریچر۔" وہ ذہن پہ زور ڈال کر بولیں۔

"لٹریچر۔۔۔ یہ کونسا۔۔۔ اوہ۔۔۔ لٹریچر۔" میں مسرور ہوا۔ (ضرور اردو یا انگلش لٹریچر پڑھتی ہوگی۔ واہ۔۔۔ دینی تعلیم بھی اور ادبی تعلیم بھی۔ میرا گھر سنور جائے گا۔)

میں نے کرائے پہ فلیٹ حاصل کیا۔ قلم کی بدولت اتنا مل جاتا تھا کہ گزارا ہو جاتا تھا۔ مہنگائی ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ میں بھائیوں کے ساتھ رہوں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر میری بیوی کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ اپنا چھوٹا سا گھر میں نے اپنی محنت کی کمائی اور آرزو کے سادہ سے جہیز سے سجالیا۔ مجھے آج بھی اپنی اور آرزو کی پہلی ملاقات یاد ہے۔ (ضروری نہیں کہ صرف خوشگوار یادیں ہی حافظے پہ قابض رہیں۔ کبھی کبھی۔۔۔)

وہ ہماری سہاگ رات تھی' عام سہاگ راتوں سے بے حد مختلف کیونکہ یہ ایک رومانوی شاعر کی سہاگ رات تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ آرزو اپنے جہیز کے بیڈ پہ لال غرارے میں لمبا سا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے بادامی رنگ کی شیروانی کی جیب تھپتھپا کے اس انگوٹھی کی موجودگی کا اطمینان کیا جو میں نے اسے منہ دکھائی کے تحفے کے طور پہ دینے

کے لیے خریدی تھی۔ اگرچہ منہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا تصویر میں۔ تصویر کا قصہ بھی عجب ہے۔ میں نے آپاں سے اپنی متوقع زوجہ کی ایک عدد تصویر کی فرمائش کی۔ کچھ پس وپیش کے بعد وہ لانے پہ راضی ہو گئیں۔ تصویر آئی تو میں آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر اس گروپ فوٹو کو دیکھنے لگا جس میں کھڑی آٹھ نو لڑکیوں میں سے مجھے یہ دریافت کرنا تھا کہ ان میں آرزو کون سی ہے۔ آپاں کے انگلی رکھ کے بتانے پہ میں نے سکوڑی ہوئی آنکھوں کو مزید نچوڑا۔

"یہ جو پچھلی لائن میں ان دو بڑے منہ والی لڑکیوں کے درمیان کھڑی ہے۔"

اور وہ درمیان میں کھڑی نہیں تھی بلکہ پھنسی ہوئی تھی اور ان دو لڑکیوں کے صرف منہ ہی بڑے نہیں تھے، وہ خود بھی بہت بڑی تھیں۔ اگلی رو میں کھڑی چاروں لڑکیوں کی وجہ سے یہ بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے شانوں کے اوپر سے گردن اونچی کر کے چہرہ دکھانے کی کوشش کرنے والی آرزو قد و قامت کی کیسی ہے۔ تصویر کے دھندلے رنگ سے اس کے چہرے اور بالوں کی رنگت کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بس انسان کی بچی لگ رہی تھی۔ دوسری بار میں نے تاکید کر کے کلوز اپ میں تصویر بھجوانے کی فرمائش کی۔ اس بار جو تصویر آئی وہ واقعی کلوز اپ تھا مگر اس قدر کلوز سے لیا گیا تھا کہ پورا ماتھا اور آدھے ابرو تک فوکس میں آنے سے رہ گئے تھے۔ ٹھوڑی اور کان تک کٹے ہوئے تھے۔ آوٹ آف فوکس ہونے کی وجہ سے اس تصویر میں بھی چہرہ دھندلا سا تھا۔ البتہ مجھے یہ تسلی ہو گئی کہ لڑکی کی رنگت صاف، آنکھیں بڑی بڑی اور کالی ہیں۔ ناک کچھ مشکوک سی لگ رہی تھی۔ پتہ نہیں واقعی اتنی پھیلی ہوئی تھی یا تصویر اوپر چڑھ کے کھینچی گئی تھی، اس لیے وزن کی وجہ سے بیٹھ گئی۔ گھونگھٹ اٹھاتے ہی سب سے پہلے میں نے یہ اطمینان کیا۔ شکر ہے کہ ناک خاصی ستواں تھی۔ ہونٹ بھی نازک سے تھے۔ اب میں نے انگوٹھی اس کی نذر کرتے ہوئے ذرا افسوس نہ محسوس کیا۔

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں، یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

اس کا گدرایا ہوا سا نرم نرم ہاتھ تھام کر میں نے بڑے ہی لُٹ جانے والے انداز میں یہ شعر پڑھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے حوصلہ بڑھایا تو اس کا ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ کے میں نے دوسرا شعر سنانے میں کسی تکلف سے کام نہ لیا۔

اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہوں کہ کوئی اور ہے، دنیا ہے کہ تم ہو

"جی یہ میں ہوں، آرزو۔" اس نے کچھ الجھ کے۔۔۔ یقین دلانے والے انداز میں وضاحت دی۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ شاعری کے معاملے میں اس کی کم فہمی پہ بھی اور اس کی کھردری کرخت آواز۔۔۔ بے لوچ اور قدرے دیہاتی لب و لہجے کو سن کر بھی۔ بمشکل مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے خود کو یہ کہہ کر بہلایا کہ اتنا مکمل تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ آواز سے مار کھاتی ہے تو کیا ہوا، صورت شکل تو لاکھوں میں ایک ہے۔

"میں جانتا ہوں تم آرزو ہو، میری آرزو۔۔۔ بلکہ میری تمام تر آرزوؤں کی تعبیر ہو۔ یہ تو میں نے تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اشعار کہے ہیں۔"

"میں بھی آپ کو شعر سناؤں۔"

"زہے نصیب۔" میں کِھل اٹھا۔

"عرض کیا ہے۔

مقدّر میں لکھے تھے تم اسی سال
میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میرے منہ کھول کر دیکھتے رہنے کو وہ شاید داد دینے کی کوئی ادا سمجھی۔ اپنا بھاری آنچل درست کرتے ہوئے پھر سے گویا ہوئی۔

تمہیں پاکر میرا ہوا ہے وہ حال
تے بھگ گئے کنڈلاں والے بال

میں سمجھ گیا کہ آپاں نے ایک گہری سازش کے ذریعے مجھ سے میرے بزرگوں کا کوئی بدلہ لیا ہے۔

سلگتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

"کیا تم نے واقعی بی اے کے پرچے دیے ہیں۔"

"ہاں جی۔" اس نے مٹکا سا سرہلایا۔

"کیا تمہیں یقین ہے' وہ بی اے کے پرچے ہی تھے۔" میں نے دہرایا۔

"ہاں جی! کوئی پہلی دفعہ دیے ہیں جو پتہ نہ چلتا۔ دو سال سے دے رہی ہوں۔"

"کیا؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"بی اے کے پرچے اور کیا۔"

"اور ایف اے۔۔۔؟"

"ہائے نہ پوچھیں جی! اس کے مکمل پرچے تو تین سال تک دیے تھے' چوتھے سال کمپارٹ کی وجہ سے انگلش اور مطالعہ پاکستان کے بھی دینے پڑے۔ ہاں دسویں میں نے "سوکھی" (آسان) کرلی تھی۔ پہلی بار رہ گئی تھی پانچ پرچوں میں لیکن دوسری بار صرف انگلش اور حساب کے پرچے دوبارہ دینے پڑے لیکن میں نے کہہ دیا ہے جی! اب رزلٹ آیا تو چاہے کمپارٹ آئے لیکن میں نے کوئی دوبارہ پرچہ نہیں دینا۔" وہ چند گھنٹے پرانی دلہن کمال بے تکلفی سے اپنا شاندار تعلیمی ریکارڈ سنانے کے بعد اب کندھے ہلا ہلا کے لاڈ کا مظاہرہ کررہی تھی۔

"سنا ہے تم نے بی اے میں اسلامیات اور لٹریچر رکھا ہوا تھا انگلش لٹریچر' یا اردو۔۔۔"

"پنجابی لٹریچر' اس میں میں بڑی تیز ہوں۔ ایک تو یہ ویسے ہی میٹھی زبان دوسرا میری ماں بولی۔ اور تیسری بات آسان بھی ہے۔ آج تک اس میں فیل بھی نہیں ہوئی۔ ایف اے میں بھی ہر دفعہ پنجابی میں ہی زیادہ نمبر آئے۔" اب مجھے اس کے لہجے میں جھلک مارتے ملتانی اور سرائیکی انداز کا راز معلوم ہوا۔

اگلے کئی دن اس کی ہمہ صفت شخصیت کے نت نئے پہلو مجھ پر آشکار ہوتے رہے اور میں مایوسی کا شکار ہوتا گیا۔ تعلیم نے اس کا کچھ نہ سنوارا تھا بلکہ وہ تین تین سال ایک ہی کلاس میں لگا کر تعلیم کا بہت کچھ بگاڑ چکی تھی۔ بلا کی باتونی تھی۔ اس کا اندازہ پہلی رات کو ہی اس کے بلا تکان بولنے سے ہوگیا تھا۔ جلد ہی یہ بھی پتا چل گیا کہ اسے دوسروں کی سننے سے زیادہ اپنی کہنے سے دلچسپی ہے۔ وہ اتنی گھریلو اور سگھڑ نہیں تھی جتنا کہ ظاہر کرتی تھی۔ تین چار گھنٹے کچن میں نبرد آزمائی کرنے کے بعد وہ کھانا توڑے میں سلیقے سے سجا کے لے آتی جو بلاشبہ لذیذ بھی ہوتا تھا' مگر اتنے میں کچن کا حشر برا ہوچکا ہوتا۔ نمک مرچوں کے ڈبوں کے ڈھکن الگ پڑے ہوتے' گھی کا ڈبہ کھلا پڑا ہوتا۔ سالن بھی بغیر ڈھکے چھوڑ آتی۔ گندے برتنوں کا ایک ڈھیر سنک میں اور سبزیوں کے چھلکوں کا انبار فرش پر لگا ہوتا۔ انڈے بناتے ہوئے بھی چھلکے وہ بلا تکلف پیچھے کی جانب بغیر دیکھے پھینک دیا کرتی تھی چاہے وہ کسی کی ناک پہ جالگیں' دودھ کی دیگچی میں جاگریں یا پانی کے بھرے جگ میں تیرنے لگ جائیں۔ خوب دبا کے کھانے کے بعد وہ برتن اٹھائے بغیر وہیں پیر پسار کے سوجانے کی عادی تھی۔ کھانے میں شاید نیند یا نشے کی کوئی ایسی دوا شامل ہوتی تھی جو صرف اس پر اثر کرتی تھی۔

سب سے زیادہ جو چیز میرے لیے تکلیف دہ تھی' وہ یہ کہ وہ میرے علم اور میرے فن کا احترام نہیں کرتی تھی۔ اسے میری شہرت کی قدر نہ تھی۔ میرے لکھنے کے اوقات میں کبھی اس نے مجھے ذہنی یکسوئی یا سکون مہیا کرنے کی کوشش نہ کی۔ تب میرا کرائے کا فلیٹ بھی دو کمروں پہ مشتمل تھا۔ ایک ہمارا بیڈ روم' دوسرا لاؤنج یا ڈرائنگ روم' اس مختصر سے فلیٹ میں میں اگر اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو بھی ناکام رہتا۔ اگر میں اپنے بیڈ پہ بیٹھ کے لکھتا۔ (کہ بیڈ روم اس قدر تنگ تھا کہ کرسی میز رکھنے کی جگہ ہی نہ تھی) تو اسے بھی آرام کرنا یاد آجاتا اور وہ اس قدر کروٹیں بدلتی' ٹانگیں جھلاتی کہ مجھ سے تحریر کرنا دشوار ہوجاتا۔ اگر دوسرے کمرے میں پناہ لیتا تو تب آرزو بیگم کی رگ موسیقی پھڑک جاتی۔ وہ آکر ٹی وی یا ٹیپ ریکارڈر آن کردیتی' پورا کمرہ نور جہاں کی آواز کی دہشت سے تھرا اٹھتا۔

میں دل تیرے قدماں وچ رکھیا

توجا کے دکھاتے سہی
توپیرا تپاتے سہی

اور میں اس کی دھمکی میں آجاتا' جا کے دِکھانہ پاتا

"سن سن بھابی ڈھول پیا وجدا
نی ڈھول نہ وجے تے میلہ ذرا نئیں سجدا

اس کے ڈھول کی ڈھماڈھم میرے اس افسانے میں بھی اتر آتی جس میں میں ہیرو ہیروئن کا ملن پیرس کے دریائے سین کے روشنیوں میں ڈوبے ساحل پہ کرا رہا ہوتا..... دریائے سین کا پرجوش نیلگوں پانی سرسوں کے پیلے پیلے کھیتوں میں بدل جاتا۔ پیانو پہ تھرکتی ہیرو کی انگلیاں ہوا میں پیچ لڑانے لگتیں اور خوبصورت نازک اندام فرانسیسی حسینہ لاچے کرتے میں کُدکڑے لگانے لگتی۔

دوروں دوروں اکھیاں مارے
منڈا پٹواری دا

"خدا کا واسطہ ہے آرزو! اپنے اس بھونپو کو لے کر یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔" میں نے اپنے افسانے کا حشر نشر ہوتے دیکھ کر بال نوچ ڈالے تھے۔

"ہائے' ہائے چٹا جھاٹا (سفید بال) ہیں' اس طرح تو نہ دونوں ہاتھوں سے پٹو (نوچو) لو میں جا رہی ہوں بنیرے پہ۔ آپ آرام سے صفحے کالے کرو۔"

جب وہ میرے لکھنے کو صفحے کالے کرنے کا نام دیتی تو میرا خون کھول کے رہ جاتا۔ جب وہ ہماری اچھی بھلی بالکونی کو "بنیرا" قرار دیتی' میرا کھولتا ہوا خون..... ظاہر ہے مزید کھولنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ علم و فن سے اتنی بے بہرہ' ادب سے اس قدر نا آشنا' بد ذوق و بد شوق قسم کی بیوی کی رفاقت میں میرے قلم کو گھن لگ سکتا ہے' لیکن حیرت انگیز طور پہ میری تحریر میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ شاید یہ دکھ کا اعجاز تھا۔ من پسند رفیق میسر نہ آنے کا دکھ۔ ایک ہم ذوق ساتھی سے محرومی کا دکھ۔ سارے دن کی تلخی میں راتوں کو جاگ جاگ کر صفحے کالے کر کے نکالتا۔

شادی کے پانچ سال میں دو شہرۂ آفاق ناولز' تین شعری مجموعے' ایک بیٹی اور ایک بیٹا میری قابل ذکر تخلیقات تھیں۔ اخبار کی جاب نے میرے مستقل روزگار کا بندوبست بھی کر دیا۔ معاشی حالات بھی سُدھر گئے۔ اس دو کمروں کے فلیٹ سے نکل کر میں ایک نسبتاً" بڑے کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔ ایک نئی ہاؤسنگ اسکیم میں نہایت سستا پلاٹ بھی لے لیا۔ اگلے کچھ سالوں میں میں نے اس کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا۔ اور دو سال پہلے ہی میں اپنے اس گھر میں شفٹ ہوا تو پچھلے بیس سالوں کی تھکان پل بھر میں زائل ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے آج میں اپنے بچوں کے لیے کچھ کر پایا ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت ذہین و فطین سلجھے ہوئے خوبصورت بچوں سے نوازا تھا۔ خصوصاً" میری بیٹی جاناں..... اس کی ذہانت سے بھرپور چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ اس کم عمری میں اس کی سلجھی ہوئی دانشورانہ گفتگو سن کر میرے حوصلے جوان ہو جاتے تھے۔ میری امید بندھنے لگتی تھی کہ وہ ضرور مستقبل میں میرا نام روشن کرے گی۔

آج اپنی جدوجہد کے بیس سال اور شادی کے پندرہ سال بعد اپنی زندگی پہ نظر دوڑاتا تو بظاہر کسی چیز کی کمی نظر نہیں آئی۔ زندگی نے لیا کم' دیا زیادہ تھا۔ اس کے باوجود ایک تشنگی سی تھی جو نہ دل سے نکلتی تھی نہ روح سے۔ ایک ادھورے پن کا احساس تھا جو کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اپنے دوستوں کو اپنی اپنی شریک حیات کے ساتھ مگن و مطمئن دیکھتا تھا تو کڑھ کے رہ جاتا تھا۔ شادی جیسے اہم اور نازک معاملے کی ساری ذمہ داری آپاں صغراں جیسی خاتون کے سر ڈال دینے والی اپنی حماقت میں آج تک معاف نہیں کر سکا۔ یہ وہی تھیں جن کی وجہ سے ملک کے ایک عظیم دانشور' نامور مصنف' فکر انگیز کالم نویس' شہرت یافتہ صحافی' حساس شاعر اور قابل قدر ادیب کے نصیب میں آرزو جیسی علم و ادب سے بے بہرہ' حسن ذوق سے کوری اور انتہائی بے ڈھب و بے اطوار خاتون آئی۔

❁ ❁ ❁

"سرابہ ادبی نشست والوں کی جانب سے دعوت نامہ آیا ہے۔ کسی شعری مجموعے کی تقریب رونمائی ہے۔ آپ کو مہمان خصوصی بنانے کی درخواست بھی کی گئی ہے۔"

میرے اسسٹنٹ نے مجھے مطلع کیا۔ مہمان خصوصی بننے کا چسکہ بہت تھا مجھے اور اس چسکے کو پورا کرنے کے لیے مجھے بے کار ترین کتابوں پہ بھی دیباچے لکھنے کو کہے جاتے یا مقالے پڑھنے کی درخواست کی جاتی۔ میں وہ بھی قبول کرلیتا۔ اور یہ دعوت نامہ جس ادبی نشست کی جانب سے آیا تھا اس کا تو خاصا نام تھا انہوں نے کئی ابھرتے ہوئے شاعروں کو متعارف کرایا تھا۔ پچھلے سات سالوں سے میرا کوئی بھی شعری مجموعہ منظرعام پر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس دوران میرے دو نئے ناول اور ایک سفرنامہ ضرور چھپ کے مقبول عام ہوچکا تھا۔ دراصل ناول لکھنے کے دوران دل سے زیادہ دماغ متحرک رہتا ہے۔ احساسات سے زیادہ تکنیک، مہارت وغیرہ کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ اور دماغ تو میرا چلا ہوا۔۔۔ اوہو خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔۔۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میرا دماغ اب بھی خاصی چالو حالت میں ہے، ناول نگاری کا میرا فن مزید نکھر چکا ہے۔ مگر شاعری سراسر دل کی زبان ہوتی ہے اور میرا دل وہ بھی اب میری طرح عمر کے اڑتالیسویں سال میں داخل ہوچکا ہے۔ سنا ہے شاعروں کے دل ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ مگر میری جوانی کو تو آرزو کھا گئی۔ میرا آخری شعری مجموعہ حسب توقع پذیرائی حاصل نہ کرسکا تو ظاہری بات ہے کہ میرا دل اچاٹ ہوگیا۔ شاعری کی جانب رجحان بھی کم رہا۔ کچھ سالوں سے جو کچھ بھی لکھا ہے، فی الحال شائع کرانے کی ہمت نہیں کہ بطور شاعر میری ساکھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میرے ابتدائی شعری مجموعے اب تک نوجوان لڑکے لڑکیاں شوق و ذوق سے خریدتے ہیں اور محبت کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے کو تحفے میں بھی دیتے ہیں۔

مشاعروں میں شرکت بھی اب کم کم ہی ہوتی ہے، خصوصاً" بیرون ملک ہونے والے مشاعروں میں مجھے اب مدعو نہیں کیا جاتا۔ اس لیے مذکورہ کتاب، جس کی تقریب رونمائی کے لیے مجھے عزت بخشی جارہی تھی۔ اس کی شاعرہ میرے لیے قطعی اجنبی ہونی چاہئیں کیونکہ ان محترمہ کا تعلق اوسلو ناروے سے تھا اور وہیں ہونے والے اردو مشاعروں میں وہ شرکت کیا کرتی تھیں لیکن میں شاعرہ کا نام پڑھتے ہی چونک گیا۔

"غزالہ درخشاں غزل۔"

یہ نام میرے لیے قطعاً" اجنبی نہ تھا۔ میں نے کتاب کی پشت پہ دیکھا۔ یا تو غزالہ نے کوئی منتر پھونک کے اپنی عمر سن ستاسی پہ روک رکھی تھی یا پھر میری طرح وہ بھی کتابوں پہ اپنی اٹھارہ سال پرانی تصویریں چھپوانے کی شوقین تھی۔ میں نے بے تابی سے اوراق پلٹے، وہی انداز۔۔۔ وہی فکر۔۔۔ وہی الجھن۔۔۔ وہی کھٹے میٹھے جذبات۔۔۔ میں حیرت زدہ ہوگیا۔ بیشتر غزلیں وہ تھیں جو میں نے اس کے حسن کے قصیدے، یا عشق کی تڑپ میں بے قرار ہوکے لکھی تھیں اور اس نے میرا ہاتھ تھام کے اپنی غزالی نشیلی آنکھیں میری ڈبڈبائی آنکھوں میں گاڑ کے اپنی بے حد شیریں و مخمور آواز میں یہ فرمائش کی تھی۔

"فلک! آپ کو قسم ہے میری محبت کی ان اشعار کو زمانے کی ہوا مت لگنے دینا، ورنہ میرا عشق بدنام ہوجائے گا۔ یہ غزلیں صرف میرے دل پہ کندہ ہونے کے لیے ہیں ان پہ صرف میرا حق ہے۔"

اس کی ایسی باتیں ہی تو مجھ سے رومان پرست شاعر کو لوٹ جاتی تھیں۔ میں نے وعدہ کرلیا تھا ان غزلوں کو اس کے نام منسوب کرکے اسی کو تحفے میں دے دی تھیں۔ اور اس نے۔۔۔ اس نے ان غزلوں کو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کرالیا تھا۔ یہ تبدیلی بھی بس وہاں کی گئی تھی، جہاں سے پڑھنے والے کو شاعرہ کے بجائے کسی شاعر کا گمان گزرتا۔ مجھے ہلکا سا گلہ ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے انتساب پڑھتے ہوئے یہ گلہ بھی دور ہوگیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"اس کے نام، جس نے مجھے غزل کہنے کا ہنر سکھایا"

جس نے میرے فن کو نکھار دیا۔"

"ظاہر ہے' یہ عظیم ہستی سوائے میرے اور کون ہو سکتی تھی۔ میں اس کی اس حرکت کو بھی حسن کی اک ادا جان کے درگزر کر گیا۔ میں نے اس محفل میں جانے کا عندیہ ظاہر کر کے اپنے اسسٹنٹ کو بتا دیا۔

❁ ❁ ❁

"اجی! سنتے ہو؟"

اپنے بچے کھچے بالوں میں انتہائی احتیاط سے کنگھا چلاتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ کے رہ گیا۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں میں اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتا تھا۔ یہاں میری الگ دنیا بسا کرتی۔ اوپر کے پورشن میں بیڈ روم بنانے کا فیصلہ بھی درحقیقت ایک گہری سازش تھی۔ آرزو کو ہمسائیوں سے قابل رشک تعلقات بنانے کا مراق تھا' کچن سے بھی اس کی گہری یاری تھی۔ یہ یارانے اوپر والے پورشن میں بیٹھ کے نہیں نبھائے جا سکتے تھے۔ سو وہ دن کا بیشتر حصہ نیچے گزارا کرتی۔ ہاں کبھی کبھی اچانک دھاوا ضرور بول دیا کرتی جیسے کہ اس وقت اس نے کیا۔ میں نِک سُک سے تیار' خوشبوؤں میں نہایا' گنگناتے ہوئے اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ جب اس نے صورِ اسرافیل عین میرے کانوں میں پھونکا۔

"اجی! سنتے ہو؟"

میرا ہاتھ کانپا اور کنگھے کا ایک سرا میری آنکھ میں زور سے لگ گیا۔ میں نے اپنی ساری جھنجلاہٹ اسی پر نکال دی۔

"تمہیں ساری عمر تمیز نہیں آئے گی۔ کتنی بار کہا ہے کہ یوں چھاپہ مارنے کے انداز میں کمرے میں داخل مت ہوا کرو۔ آنے سے پہلے دستک دیا کرو۔"

"کیوں جی' آپ کیا کپڑے بدل رہے تھے جو میں دروازے بجا کے آتی۔ ویسے بھی دروازے تو مہمان بجایا کرتے ہیں۔ میں کیا اپنے ہی کمرے میں مہمان ہوں؟" اس نے میری آنکھ پہ اپنے دوپٹے کا گولا سا بنا کے رکھتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹانے والی ہدایت پر اعتراض پیش کیا۔ میں پہلے ہی آنکھ کے درد سے بے حال تھا۔ اس نئی افتاد پہ بوکھلا گیا۔ لان کے دوپٹے سے گرم مسالوں اور لہسن کی بدبو کے بھبھکے اٹھ رہے تھے۔

"بیگم! یہ میری آنکھ ہے' بریانی کا دیگچہ نہیں جسے تم دم دے رہی ہو۔" اس نے میری آنکھ پہ رکھے دوپٹے کے گولے پہ منہ لگا کر زور زور سے پھونکیں مارنا شروع کیں تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"ابھی آرام آجاتا ہے' ذرا اپنا شوخاپن کنٹرول میں رکھو جی کچھ دیر۔"

میری حس مزاح کو وہ ہمیشہ شوخاپن قرار دیتی تھی۔ اگرچہ اس وقت میں نے ہرگز کوئی لطیف مذاق نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ آنکھ کے پپوٹے کو جس طرح زور سے بند کر کے وہ دوپٹے کی مدد سے گرم گرم بھاپ' مسالوں کی خوشبو میں لپیٹ کر مجھ تک پہنچا رہی تھی' مجھے خود پہ بریانی کی دیگ کا ہی گمان ہو رہا تھا۔

"یہ دیکھو جی' آگیا آرام۔۔۔۔"

اس نے میرا چہرہ ٹھوڑی سے تھام کر آئینے کے سامنے اس انداز میں کیا جیسے کوئی ماہر بیوٹیشن کسی گئی گزری صورت کو اپنے ہنر کی بدولت اپسرا کا روپ دینے کے بعد فخریہ انداز میں آئینے کے روبرو کر کے داد طلب ہوتی ہے۔ میری دائیں آنکھ میں ابھی تک ہلکی سرخی باقی تھی۔ البتہ درد کو آرام آگیا تھا۔ میں نے اپنا چشمہ درست کیا۔

"لو' یہ تو بھول ہی گئی کہ بات کیا کرنی تھی۔" اس نے وہ حرکت کی جو کرنے کی میری ہمیشہ حسرت ہی رہی' یعنی کہ ایک زوردار ہاتھ اپنے ہی سر پہ رسید کیا۔

"شکر ہے اللہ کا۔۔۔۔" میں زیر لب بڑبڑا کے اپنا موبائل اور والٹ وغیرہ کوٹ کی جیب میں ڈالنے لگا' آج عرصے بعد میں نے ٹو پیس پہنا تھا اور وہ بھی ڈرائی کلین کروا کے۔۔۔۔ ورنہ شلوار قمیص پہن پہن کر میرا سراپا ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ پینٹ میں یہ آسانی ہے کہ توند کنٹرول میں رہتی ہے۔ ذرا بیلٹ باندھنے میں دقت ہوئی یا پتلون ٹائٹ محسوس ہو۔ تو انسان خود بخود اپنے

کھانے پینے پہ کنٹرول کرلیتا ہے' یا وزن کو دوبارہ پہلے والی حالت میں لانے کے لیے جاگنگ وغیرہ شروع کردیتا ہے۔ جب کہ گھیردار شلوار قمیص میں یہ وارننگ والی سہولت موجود نہیں۔ دو گز لمبا ازار بند ہر سائز کی توند کے مطابق ایڈجسٹ ہوجاتا ہے۔ آج سالوں بعد اسے پہننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرا وزن بھی خاصا بڑھ گیا ہے۔ ایک نوزائیدہ سی توند "جھا" کررہی تھی۔ میں نے کوٹ کے نچلے سبھی بٹن بند کرکے اس توند کی پردہ پوشی کی۔ بال بھی اس طریقے سے بنا کر اسپرے کیا کہ میرا وسیع ہوتا ماتھا ڈھک گیا۔ عینک اتارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہاں تقریر بھی کرنا تھی۔ ویسے بھی سلور فریم والا یہ چشمہ مجھے سوبر اور حقیقی دانشور ظاہر کرتا تھا۔ خوب رگڑ کے شیو تو میں کرچکا تھا اور کل ایک مہنگے ہیئر سیلون سے بال بھی اس انداز میں ڈائی کروا چکا تھا کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ ان بالوں کی سفیدی ڈھکنے کے لیے اوپر رنگ سازی کی گئی ہے۔

"ہائے ہائے' یہ آپ کے بالوں کے ساتھ کیا ہوگیا جی؟" نظر پڑتے ہی اس نے تاسف سے ہاتھ ملنا شروع کردیے۔

"کیا ہوا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔" میں پہلو بچا کے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ دروازے کے عین درمیان میں ڈٹ گئی۔

"لگتا ہے تیل کے بجائے فینائل یا باتھ روم دھونے والی بلیچ لگالی ہے۔ عینک کے بغیر آپ کو نظر بھی تو "ککھ" نہیں آتا۔ ہائے ہائے۔ پہلے ہی چار بال رہ گئے تھے' ان کا بھی ناس ہوگیا۔ دیکھو ذرا کیسے نسوار کی رنگت کے ہوگئے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تک آگئے۔

"تم نے نسوار کبھی دیکھی بھی ہے؟" میں بھنا گیا۔

"دیکھ تو رہی ہوں' آپ کے سر پہ گری ہوئی۔"

"احمق عورت! میں نے بال ڈائی کیے ہیں۔" میں نے اسے ہاتھ سے پیچھے کرکے راستہ لینا چاہا۔

"تو مجھے کہنا تھا' میرے پاس ہر وقت کالی مہندی کی پڑیاں پڑی رہتی ہیں' یہ عجیب سا رنگ کیوں کرالیا ہے' نہ کالا' نہ چٹا' نہ لال' نہ براؤن۔۔۔"

"تم میرے بالوں کا تجزیہ کرنے کے بجائے وہ کرو' جو تمہیں کرنا چاہیے یعنی کدو' ٹینڈے اور بیگن پہ نئے نئے تجربات۔"

"ہاں' یاد آیا۔ میں یہی تو پوچھنے آئی تھی کہ آج رات کیا پکاؤں۔ مسالہ بھری بھنڈی' بینگن کا بھرتہ یا پائے کا شوربا۔۔۔"

"میرا آج رات کا کھانا باہر ہے۔" یہ اطلاع دیتے ہوئے میں بے حد مسرور نظر آیا۔ متوقع پُرتکلف ڈنر کے تصور سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ آج میں اس کے سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔

"تمہارا جو جی چاہتا ہے پکالو' چاہے بھنڈی کا بھرتہ ہو یا مسالہ بھرے پائے۔۔۔ یا پھر بینگن کا شوربہ۔" یہ کہنے کے بعد میں رکا نہیں' البتہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اپنی پشت پہ اس کی آواز ضرور سنی۔ اپنے پسندیدہ پکوانوں کی ترتیب میں یہ معمولی سا ردعمل اس کے مزاج پہ گراں گزرا تھا اور وہ نہایت دل سوزی سے کہہ رہی تھی۔

"ہائے۔۔۔ ریحان صاحب تو سٹھیا گئے۔ اچھی بھلی کھڑی کھڑی بھنڈیوں کا کچومر نکال کر بھرتہ بنا دیا اور بینگن کے بھرتے میں پانی ڈال دیا۔"

❁ ❁ ❁

اسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی یہ تو ثابت ہوگیا کہ کتاب پہ چھپنے والی اس کی تصویر وہی پرانی والی تھی لیکن اس بات کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ اب بھی اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہ آئی تھی لیکن شاید ہر عورت کو اپنے اس روپ سے عشق ہوتا ہے' وہ روپ جو سولہ سال کی عمر سے انیس سال کی عمر تک اس پہ چڑھتا ہے' اسی لیے وہ اپنی حالیہ تصویر کے بجائے وہی سولہ سال پرانی تصویر چھپواتی تھی جس میں اٹھارہ انیس سال کی نوخیز غزالہ اپنے نوعمر حسن کی ساری دلکشی اور رعنائی سمیٹے ہوئے تھی اور اس وقت

جو غزالہ درخشاں غزل میرے سامنے تھی' وہ پینتیس سالہ عورت تھی' ایک بھرپور عورت۔۔۔

اس کے لانبے اور گھنے گھنگریالے گہرے بھورے بال بھی اب نہ اتنے گھنے رہے تھے' نہ لانبے اور گھنگھریالے تو بالکل نہ رہے تھے۔ بمشکل شانوں تک پہنچتے۔ بالکل سیدھے ہلکے سنہری بال اسے بڑی ماڈرن شکل دے رہے تھے اور جنہیں وہ بڑی دلبرانہ سی نزاکت کے ساتھ بار بار پیچھے کی طرف جھٹکتی تھی تو ان کا مصنوعی سنہرا پن اس کی بے حد گوری رنگت پہ بکھر بکھر جاتا تھا۔ صرف بالوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس کے چہرے پہ بھی کچھ مصنوعی چیزوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں پہ نیلگوں مائل سبز رنگ کے لینس لگے تھے جو اس کی سنہری رنگت اور نئے ڈائی شدہ بلونڈ بالوں کے ساتھ بلاشبہ بڑے جچ رہے تھے۔ سلک کی گہرے نیلے رنگ کی ساڑھی کے پھسلتے پلو پہ سبز دھاگے کے کام نے اسے کسی مورنی کا سا پیراہن اوڑھا رکھا تھا۔ ساڑھی اس کے متناسب سراپے پہ کتنی بھلی لگ رہی تھی۔

پہلے کی نسبت وہ قدرے گداز ضرور لگ رہی تھی مگر فربہ نہیں۔ مجھے پہچاننے میں اسے وقت نہ لگا۔ حالانکہ اٹھارہ سال پہلے کے ریحان علی فلک اور آج کے اس ادھیڑ عمر حبشی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مسکراہٹیں تو غالباً" اس وقت بھی میرے ہونٹوں پہ مستقل مکین نہ تھیں لیکن اسے سامنے پاکر کچھ دیر کی مہمان ضرور ہو جایا کرتی تھیں اور اب۔۔۔ اب تو وہ کچھ عرصے سے ایسے غائب تھیں جیسے کوئی نادہندہ لاکھوں کروڑوں کا غبن کرکے فرار ہو جائے' عمر بھر ہاتھ نہ آنے کے لیے روپوش ہو جائے۔ بال اس زمانے میں بھی پت جھڑ کا شکار تھے اور اب تو مکمل خزاں کا موسم تھا۔ وسیع و عریض ماتھے پہ شکنیں جم کے براجمان ہو گئی تھیں۔ عینک کا نمبر میری عمر کے سائز کی طرح بڑھ گیا تھا۔ گندمی رنگت خون جلا جلا کے سانولی پڑ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ مجھے پہچان کے میری طرف لپکی تو میں نے ڈیڑھ سو مہمانوں کے سامنے خود کو کئی فٹ اونچا محسوس کرتے ہوئے خود بخود اپنی گردن اکڑالی۔

"اوہ فلک جی! مجھے یقین تھا' آپ ضرور آئیں گے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ دبوچتے ہوئے نرمی سے دبا کر کہا۔ اس کی ہیرے جڑی پلاٹینم کی آدھ درجن انگوٹھیاں میرے ہاتھ میں کھب سی گئیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنے اڑتالیس سالہ جسم میں ایک لطیف سی سنسناہٹ پھیلتی محسوس کی۔

"غزالہ! تم۔۔۔ آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے' کب۔۔۔" میں' جس کا قلم کسی مجاہد کی تلوار کی طرح چلتا ہی جاتا تھا' اب لڑکھڑاتے لہجے میں بے ربط الفاظ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میرے اور نزدیک ہو کے اس نے میرے رہے سہے حواس بھی رفوچکر کر دیے۔ اس کا نیم عریاں شانہ میرے کوٹ سے مس ہو رہا تھا۔

میرا ہاتھ اب بھی اس کے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے میری کہنی تھامی اور اپنی دلفریب مسکراہٹ کو دائیں بائیں اطراف میں کچھ اور شدت سے پھیلایا۔ میں نے ہونق پن سے منہ کھول کے اس کے اس فلمی پوز کو دیکھا اور اس کی مسکراتی نگاہوں کے تعاقب میں سامنے نظر اٹھائی تو دو تین پریس فوٹو گرافرز ہمیں کیمرے کی زد میں لینے کو تیار کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی اڑی ہوئی ہوائیوں کو ٹھکانے پہ لاتا' ہمارا یہ پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑی نزاکت کے ساتھ مجھ سے ذرا سی دور ہٹی۔ البتہ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھے تقریباً" کھینچتی ہوئی آگے لے گئی۔

"آیئے فلک! میں آپ کا تعارف اپنے مہمانوں سے کراؤں۔ آپ تو خیر کسی تعارف یا تعریف کے محتاج نہیں۔۔۔ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔" اس نے کمان سے ابرو کمال دلربائی سے اچکائے۔

"لیکن آپ سے اپنے چند عزیزوں کا تعارف ضرور کراؤں گی کہ یہ ان کی بھی خوش نصیبی ہوگی۔ بہت

سے لوگ تو اس محفل میں صرف آپ سے ملنے کے اشتیاق میں چلے آئے ہیں۔"

میری پہلے سے اُچک اُچک کے نکلتی گردن مزید باہر نکل آئی۔ مجھے خود پہ کسی زرآفے کا گمان ہو رہا تھا جو بونوں کی بستی میں آنکلا ہو۔ مجھے ڈائس پہ بلایا گیا تو میں اس سے کہیں زیادہ بول گیا۔ غزالہ کی مدح سرائی میں جو کچھ میں گھر سے لکھ کر لایا تھا' وہ سامنے بیٹھی اپنی مدھر مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مزید بولنے پہ اکساتی رہی۔

"غزالہ..... غزل در خشاں..... جس کا نام ہی غزلوں کا ردھم اور نغمگی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا فن شاعری کی حبس زدہ فضا میں ایک خوشگوار ہوا کا جھونکا ہے۔ بہار کی جانب کھلنے والا دریچہ ہے۔ اس کی شاعری میں رنگ ہیں' خوشبو ہے' راتوں کی گمبھیر خاموشی ہے' شاموں کے سرمئی سائے ہیں' صبحوں کے اجالے ہیں' ستاروں کی جگمگاہٹ ہے' چاند کی نرماہٹ اور سورج کی گرماہٹ ہے' پھولوں کی سی لطافت اور جھرنوں کی روانی ہے۔"

میری اس پُرجوش تقریر کے جواب میں وہ شرمائی شرمائی سی تالیاں بجاتی اردگرد بیٹھے لوگوں کے تو صیفی کلمات کو سرہلا ہلا کے قبول کرتی رہی۔ میرے بعد اس کی باری تھی۔

"ریحان علی فلک ہمارے ملک کے گراں قدر ادیب' ہمارے بے حد قابل احترام صحافی اور بے حد خوبصورت لب و لہجے کے شاعر' میری بے حد خوش نصیبی ہے کہ وہ مجھ جیسی نو آموز شاعرہ کے بلانے پہ نہ صرف اس محفل کی رونق بڑھانے آئے بلکہ ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کا میرے کلام کو پسندیدگی کی سند عطا کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ وہ شاعر' جس کی کتابیں میرے سرہانے کے نیچے موجود رہتی تھیں اور جس کے افسانے مجھ جیسی کچی عمر کی لڑکی کو ایک نئے جہانوں میں لے جاتے تھے' اس کا میری کتاب کے بارے میں ایسے کلمات کہنا میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔"

میں ٹھٹک سا گیا۔ اگرچہ اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اب یہ توصیفی کلمات مجھے مغرور کر دینے کے لیے کافی تھے لیکن میں توقع کر رہا تھا' وہ اپنی تقریر میں ہماری وابستگی کا نہ سہی' دوستی کا حوالہ ضرور دے گی۔ ہمارے ایک ساتھ تعلیمی مدارج طے کرنے کا تذکرہ بھی کرے گی مگر وہ تو خود کو میری ایک ٹین ایج فین ثابت کرنے پہ تلی ہوئی تھی جیسے میری کتابیں پڑھ پڑھ کے جوان ہوئی ہو۔ اس کا ہلکا سا گلہ میں نے چائے کے لوازمات پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے کیا۔

"اوہ فلک جی! سمجھا کریں نا' میں نہیں چاہتی کہ لوگ ہماری دوستی کو کسی اور تناظر میں دیکھیں۔ آپ سے تعلق میرے لیے قابل فخر ہے۔ بلیومی۔ کہنے ہی والی تھی مگر اس سے پہلے آپ نے بے تکلفانہ میری اور میری شاعری کی جو تعریفیں کیں' ان کے بعد مجھے لگا کہ اب میں نے یہ بات ظاہر کی تو لوگ سمجھیں گے آپ نے یہ سب کچھ دوستی کے ناتے کیا اور میں دوستی کی وجہ سے آپ کی شہرت اور ساکھ کو استعمال کر رہی ہوں۔"

اس کی وضاحت مجھے بے حد بھائی اور میں زیادہ رغبت سے چکن پیٹیز کھانے لگا۔ وہ بڑی نفاست سے پچھلے پندرہ منٹ سے اپنی پلیٹ میں رکھی ایک چاکلیٹ پیسٹری کو کتر رہی تھی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے کزن' میرا مطلب ہے شوہر کا نام اخلاق تھا اور تم نے بڑے ذوق و شوق سے یہ نام اپنے نام کے آگے لگانا بھی منظور کر لیا تھا۔ یعنی غزالہ اخلاق..... تو کیا اب اپنے شوہر کا نام استعمال کرنا ترک کر دیا ہے تم نے؟"

"نہیں۔" اس نے یکایک ساری پیسٹری اٹھا کے منہ میں رکھ لی۔ "میں نے شوہر ترک کر دیا ہے۔"

"کیا.....؟ کیا مطلب؟" مطلب واضح تھا' اس کے باوجود میں پوچھ رہا تھا۔ "ایسی کیا بات ہو گئی' وہ تو تمہارا فرسٹ کزن تھا۔ بڑا کامیاب انجینئر تھا' معقول ملازمت....."

"مگر وہ خود خاصا نامعقول ثابت ہوا۔" اس نے بیزاری سے میری بات کاٹی۔

"اخلاق کا اخلاق دن بدن گرتا جارہا تھا۔ وہ ہر وہ حرکت کرتا تھا جس سے میں چڑتی تھی۔ ہر اس کام میں دلچسپی ظاہر کرتا تھا جسے میں ناپسند کرتی ہر وہ چیز پسند کرتا جس سے مجھے نفرت تھی۔ وہ نفسیاتی مریض تھا فلک جی! مجھے ترپا کے اسے تسکین ملتی تھی مگر میں بھی کوئی پچھلی صدی کی گونگی بہری پتھر کی عورت نہ تھی جو چپ چاپ برداشت کرتی رہتی۔ ڈیڑھ سال... پورے ڈیڑھ سال میں نے گزارا کیا۔" اس نے داد طلب انداز میں اپنے صبر و برداشت کا "طویل دورانیہ" بیان کیا۔ میں سچ مچ متاثر ہو گیا۔

"میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ حق مہر تک کی پروا نہ کی۔ الٹا وکیلوں پہ میری کتنی ہی رقم خرچ ہوئی۔ اتنا خرچا تو میرے ماں باپ نے میری رخصتی پہ نہ کیا ہو گا جتنا خرچا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں لگ گیا۔ خیر... مجھے خرچے کی پروا نہ تھی اور نہ ہی اس کی مجھے کمی تھی' سارے اخراجات تو..."

"تو تم زندگی کے اس سفر میں ایک طویل مدت سے تنہا ہو۔" میں نے بے تابی سے اس کی بات کاٹی۔ اس وقت وہ مجھے ایسا کارنر پلاٹ لگ رہی تھی جس کا کوئی دعویدار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حق ملکیت کے بارے میں اسٹامپ پیپر تیار کروانے کا سوچتا' وہ کہہ اٹھی۔

"فلک جی... یہ نہ تھی ہماری قسمت۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"زندگی کے سفر میں تنہا ہونا بھی بذات خود ایک بہت بڑی عیاشی ہے جس سے میں ہنوز محروم ہوں۔ یہ سیٹھ باٹلی والا ہی تو تھا جس کے آسرے پہ میں نے اخلاق سے طلاق لینے کا قدم اٹھایا تھا' ورنہ ایک انجان ملک میں' میں ایک اکیلی' بے سہارا' مظلوم عورت کیسے زندگی گزار سکتی تھی۔ وطن واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں' ابا میری ایک نہ سنتے۔ اس اخلاق نے نجانے میری خود سری اور من مانی کے کیسے کیسے من گھڑت قصے یہاں سنا رکھے تھے۔ ایسے میں سیٹھ باٹلی والا کا دم غنیمت تھا۔ وہ ایک انڈین نژاد مسلمان تھا۔ آگرے کا مشہور ساڑھیوں کا بیوپاری۔ طلاق کے مقدمے کے بیشتر اخراجات بھی اسی نے اٹھائے۔ مجھے اس سے محبت نہ تھی مگر جینے کا کوئی سہارا تو ہونا چاہیے تھا سو..." اس نے شانے اچکائے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس پلاٹ پہ کسی نے ناجائز قبضہ جما لیا ہو۔

"اور آپ سنائیے فلک جی! کیسی گزر رہی ہے۔" وہ مسکرائی تو مجھے لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو' جیسے وہ سب جانتی ہو۔ مجھے آرزو کے مقابلے میں خود اس کا شوہر سیٹھ باٹلی والا یاد آیا اور میں کچھ ریلیکس ہوا۔ صرف میں ہی نہیں' وہ بھی ایک کورے ذوق والے "بے ادب" شخص کی سنگت میں جیون گزارنے پہ مجبور تھی۔

"آ... کسی روز کسی دکھ پہ اکٹھے روئیں..." میں گنگنایا مگر وہ اب کسی اور جانب متوجہ تھی۔

اس شام گھر واپسی پہ میں متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ ایک طرف عرصے بعد غزالہ جیسی دلکش و باذوق عورت کی صحبت کی خماری تھی۔ دوسری طرف رہ رہ کر اپنی بد نصیبی کا خیال آتا تھا کہ وقت کی بے رحمی کے ہاتھوں میں کیسا انمول گوہر گنوا چکا تھا۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ معاشرے میں مقام' معقول مالی حیثیت... مگر ایک من پسند اور ہم مزاج ساتھی نہیں اور جب اس ساتھ کا امکان تھا' تب میرے پاس اور ایسا کچھ نہ تھا جس کے بل بوتے پہ میں اسے فتح کر سکتا۔ مجھے آج اپنی شہرت' دولت' حیثیت... سب بے معنی اور بے مقصد لگ رہے تھے کیونکہ اب یہ میرے کسی کام نہ آسکتے تھے۔ میری حیثیت میرے لیے بے مصرف تھی' میرے لیے بھی اور میری بیوی کے لیے بھی... کیونکہ اسے قطعی یہ احساس نہ تھا کہ وہ کس عظیم دانشور' مشہور افسانہ نگار' مقبول شاعر اور نامور صحافی کی اہلیہ ہے۔ اکثر ہی وہ بڑی یاسیت سے کہتی۔

"سب عورتیں پوچھتی ہیں' تمہارا بندہ کیا کرتا ہے۔ بتاؤ' میں کیا جواب دوں انہیں۔ کسی کا ڈاکٹر ہے'

کسی کا وکالت کرتا ہے' کسی کا دکانداری کرتا ہے تو کسی کا جائیدادوں کے سودے کرتا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ میرا بندہ عینک چڑھائے اپنے کمرے میں بیٹھا صفحے کالے کرتا رہتا ہے۔"

"کاش' مجھے غزالہ جیسی قدردان بیوی ملی ہوتی۔" اس کی تقریر میں اپنے بارے میں سنے توصیفی کلمات یاد کر کے میرے دل نے یہ خواہش کی۔

لاؤنج میں کارپٹ پہ پھسکڑا مار کے بیٹھی آرزو خربوزے کی پڑے سامنے رکھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹی وی پہ جواد احمد بازوؤں کے چپو چلا چلا کے اعلان کر رہا تھا۔

"او کہندی اے سیاں میں تیری آں۔۔۔"

"آ گئے تسی' خربوزہ کھاؤ گے؟" وہ چھلکے سمیٹتی اٹھنے لگی۔

"ایک کپ چائے بنا دو۔"

"بڑے میٹھے ہیں اور ٹھنڈے ٹھار بھی۔ ریڑھی والے سے لڑ لڑ کے بیس روپے کلو لیے تھے' ورنہ وہ تو تیس روپے سے۔۔۔"

"چائے ذرا اسٹرانگ بنانا۔"

"بیج بھی وڈے وڈے نکلے ہیں۔ دھوکے سکھانے کے لیے رکھ دیتی ہوں۔ آپ کے دماغ کے لیے بڑے اچھے رہیں گے۔"

"آرزو۔۔۔ چائے۔۔۔" میں نے زور دے کر کہا۔ وہ شاید خربوزوں سے زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"ہائے ہائے' ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔"

"میں۔۔۔ میں پیچھے پڑ جاتا ہوں اور تم جو گھنٹے بھر سے اس خربوزے پہ مقالہ پڑھ رہی ہو۔"

"چلو چھڈو پارٹی کیسی رہی؟"

"بہت عمدہ۔" میرا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ "کیا نفیس حضرات مدعو تھے۔ کیا خوبصورت گفتگو ہوئی۔"

"کھانے میں کیا کیا تھا؟"

"تمہارا سر۔"

"ہا۔۔۔ ہائے۔۔۔ گھر پہ بھی میرا ہی سر کھاتے ہو اور باہر بھی۔" وہ بھونڈا سا مذاق کر کے اور خود ہی اس پہ لطف اندوز ہوتی کچن میں گئی تو میں پھر سے غزالہ کے تصور میں کھو گیا۔

وہ بولتی تھی تو لفظ مہک اٹھتے تھے۔

وہ مسکراتی تھی تو کلیاں چٹک جاتی تھیں۔

وہ ہنس دیتی تو نقرئی گھنٹیاں بج اٹھتیں۔

وہ چلتی تو جیسے کوئی تالاب پہ بچھے کنول کے پھولوں پہ سج سج قدم رکھ رہا ہو۔

وہ نظر بھی اٹھاتی تو لگتا' کچھ کہہ گئی ہے۔

اور کہہ اٹھتی تو غضب ہو جاتا۔ دلکش مدھر آواز میں وہ خوبصورت الفاظ کا سلیقے سے چناؤ۔۔۔ وہ کمال درجے کی نفیس حس مزاح' وہ شاعرانہ تصورات' وہ خیالات کی وسعت۔۔۔ واہ۔۔۔ آج عرصے بعد مجھے کسی سے مل کر سیری کا احساس ہو رہا تھا اور آج عرصے بعد ہی کسی سے مل کر مجھے تشنگی بھی بے چین کر رہی تھی۔

اس ایک ملاقات نے آئندہ ملاقاتوں کا در کھول دیا۔ وہ اب مستقل پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسی سے پتا چلا کہ اس نے ڈیفنس میں گھر بھی لے لیا ہے۔

"آپ کبھی آیئے نا ہمارے گھر' میرے شوہر آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اور میں؟"

"کیا مطلب؟"

"نہیں' کچھ نہیں۔" میں سٹپٹا گیا پھر بات بدل دی۔ "میرا مطلب ہے' میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں' کیا آپ مجھے اپنے گھر مدعو نہیں کر سکتے؟"

"وہ تو کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بیوی تم سے مل کر خوش ہو گی۔ خصوصاً" اس صورت میں جب اسے ہمارے ماضی کے تعلق کے بارے میں پتہ چلے گا۔"

"جانے دیجیے فلک جی! راکھ میں دبی چنگاریوں کو کریدنے سے کیا حاصل۔"

"یعنی ابھی چنگاریاں باقی ہیں' بے شک دبی ہی کیوں نہ ہوں۔" میں نے کریدا تو وہ ٹال گئی۔ بڑی خوبصورتی سے میری نئی کتاب کے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔

میرے کالموں کے انتخاب پہ اس نے سیر حاصل تبصرہ کر کے میرا جی خوش کر دیا۔ یہ وہی کالم تھے جن کو کبھی کبھار سرسری سا پڑھنے کے بعد آرزو سر جھٹک کے کہا کرتی۔

"اس کو کہتے ہیں۔ سانپ گزر گیا' لکیر پیٹتے رہ گئے۔ بھئی جو کھڑاک دو تین دن پہلے ہو گیا ہے۔ چاہے برا تھا' چاہے چنگا' اب اس پہ افسوس یا خوشی والا کالم لکھنے کا کیا فائدہ۔"

"تم نہیں سمجھو گی احمق عورت! اسے تجزیہ کہتے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی ہم ادیب نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ نئی رونما ہونے والی تبدیلیوں پہ غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کرنا ہی میرا کام ہے۔"

"یہ تو "داڈی" (سخت گیر) ساسوں والی عادت ہے۔"

"کپتی" (لڑاکا) قسم کی نندوں والا کام۔"

ایک بار پھر اس کی بے سروپا باتوں نے اس خوبصورت گفتگو کا مزا کرکرا کر دیا۔

اس سے اگلی ملاقات ایک اور ادبی محفل میں ہوئی جس میں اس کی شرکت میری وجہ سے ہی ممکن ہو سکی تھی۔ میرے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہی اس جیسی نو آموز شاعرہ ادبی دنیا کے بڑے بڑے ناموں کے درمیان موجود تھی۔

"فلک جی! میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی تسکین ہو رہی ہے۔ وہاں ناروے میں کیا نہیں تھا میرے پاس۔ نہ دولت کی کمی تھی' نہ آسائشوں کی۔ پورا پیلس بنا رکھا تھا ہم لوگوں نے وہاں مگر میرے اندر کی شاعرہ کی تسکین نہ ہو پا رہی تھی۔ اپنا آپ ادھورا لگا کرتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں' میرے اندر ہمیشہ سے خود کو منوانے کی لگن تھی۔"

"ایک بات تو بتاؤ غزل! دوست ہم پہلے بھی تھے' اب بھی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ پہلے میں صرف ریحان اور تم ہوا کرتا تھا' اب فلک جی اور آپ ہو گیا ہوں۔" میں نے تکلف کی یہ دیوار گرانی چاہی۔

"کیا کروں' کہاں آپ... کہاں میں ناچیز۔" اس نے بڑی ادا سے پلکیں جھپک کے کہا۔ وہ اسی طرح مجھے چنے کے جھاڑ پہ چڑھایا کرتی اور میں پھر نیچے اترنے کا نام نہ لیتا۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے قبل میں نے کبھی اپنی تعریف سنی نہ تھی۔ اس سے کہیں زیادہ پذیرائی کا میں عادی ہو چکا تھا۔ میری شہرت کی وجہ سے ہر جگہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا لیکن کسی من چاہی ہستی کی جانب سے پسندیدگی اور عقیدت کا اظہار انسان کو خود بخود مغرور کر جاتا ہے۔

"یہ تو تم کسر نفسی سے کام لے رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم جیسی خواتین کی بے حد قدر کرتا ہوں جو خود کو گھر داری کے جھمیلوں میں گم نہیں کرتیں بلکہ اپنا ذاتی تشخص بھی برقرار رکھتی ہیں اور اپنے بل بوتے پہ اپنی پہچان کراتی ہیں۔"

"یہی ذہنی ہم آہنگی ہی تو ہے جس کی مجھے ہمیشہ تلاش رہی۔" وہ خلاؤں میں اپنی خوابدیدہ نگاہیں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیوں' کیا سیٹھ باٹلی والا سے ابھی تک تمہاری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ کب ہوئی تھی تمہاری اس سے شادی۔"

"بارہ سال پہلے۔"

"بارہ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے کسی کو جاننے اور پرکھنے کے لیے۔"

"نہیں فلک جی! اگر کسی کو جاننا ہو تو ایک لمحہ کافی ہے اور اگر کسی سے مزاج کے ستارے نہ ملتے ہوں تو عمر بھر کھوجتے رہو' کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ آرزو سے میری برسوں پرانی رفاقت اس کا ثبوت تھی۔ ہم دونوں ندی کے دو کناروں کے طرح عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ایک ہی منزل پہ مگر الگ الگ۔

"بارہ سال کیا چیز ہیں' اسی لیے میں نے بارہ سال گزارنے کا رسک نہیں لیا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"سیٹھ باٹلی والا سے میں نے ڈھائی سال بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ہماری انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو سکی' نہ کبھی ہو سکتی تھی۔"

"اور... وہ جو... وہ جو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارے شوہر نے لاہور میں بزنس سیٹ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"ہاں تو شوہر کیا صرف سیٹھ باٹلی والا ہی ہو سکتا ہے۔ میرے کرنٹ شوہر کا نام آغا غفور ہے۔ بہت بڑے کنٹریکٹر ہیں۔"

"اوہ... آئی سی۔" اور میرا دل مسلسل "سی... سی" کر رہا تھا۔ کیا کمال کی رفتار تھی اس عورت کی' کیا ترقیاں تھیں' دھنت تیرے کی۔ ریحان علی فلک... بڑا مرد بنا پھرتا ہے' ایک ڈھول کیا گلے پڑ گیا' پندرہ سالوں سے اسے ہی ڈھم ڈھم ڈھما ڈھم ڈھم پیٹے جا رہا ہے۔ ذرا جو سُر اور تال بدلنے کا خیال آیا ہو۔

"ان سے تمہاری انڈر اسٹینڈنگ...؟" میں نے بڑی آس سے پوچھا۔ (پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔)

"اوہ... آثار کچھ بہتر ہی ہیں۔ ایکچوئلی آغا صاحب کو مجھ سے محبت کچھ زیادہ ہی ہے' اس لیے انڈر اسٹینڈنگ کی کمی وہ اس سے پوری کر لیتے ہیں۔ یعنی میری بات... بے شک وہ اس سے اختلاف رکھتے ہوں' بے چوں و چرا مان جاتے ہیں' ورنہ اخلاق اور سیٹھ باٹلی والا... وہ ہر بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے تھے۔ سپیکل مین... میں نے ان کی انا ان کے پاس رہنے دی اور اپنی انا بحفاظت سمیٹ کر الگ ہو گئی۔ وہ بھی خوش' میں بھی خوش۔"

❁ ❁ ❁

"پاپا! کتنے دنوں سے ہم آؤٹنگ پہ نہیں گئے۔" جاناں نے میری سوچوں کا تسلسل توڑا۔ میں نے ایک پیار بھری نظر اپنی لاڈلی بیٹی کے کھلے کھلے چہرے پہ ڈالی۔

"بیٹا جان! آپ کے سمسٹر ہو رہے تھے' اس لیے سوچا' فری ہو جاؤ پھر پروگرام بناتے ہیں۔"

"پاپا! کیوں نہ ہم مری چلیں؟" میرے بیٹے نے آئیڈیا پیش کیا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" آرزو فوراً متفق ہو گئی۔

"پہلے پاء جی کے پاس پنڈی چلتے ہیں' ان کی وڈی گڈی میں سارے "جی" (لوگ) پورے آ جائیں گے۔"

"کون کون سے "جی"؟" میں نے الفاظ چبا چبا کر پوچھا۔

آج وہ گہرے جامنی اور زرد پرنٹ کے لان کے سوٹ میں پسینے پسینے مجھے معمول سے زیادہ بری لگ رہی تھی۔

"چار ہمارے "جی" اور باقی نو "جی" پاء جی ہوراں کے۔"

"ہم فیملی ٹرپ پہ جا رہے ہیں' اس میں پاء جی ہوراں کا... میرا مطلب ہے ان لوگوں کا کیا کام۔"

"وہ بھی تو ہماری فیملی ہی ہوئے۔ آپ کے وڈے پائی ہیں وہ۔"

"مری کے پچھواڑے رہتے ہیں وہ۔ ان کے لیے نئی چیز نہ ہو گی۔ وہ تو جاتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے بدمزگی سے کہا۔ بھائیوں سے میری وابستگی ہمیشہ سے واجبی سی تھی اور بڑے بھائی نے جب سے پنڈی میں رہائش اختیار کی تھی' ملنا ملانا کم ہونے کی وجہ سے یہ برائے نام وابستگی بھی نہ رہی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں میں ان کے بیوی بچے لاہور آئے تو ایک آدھ روز ہمارے ہاں بھی رکے۔ ان کی بیوی کی آرزو سے خوب بنتی تھی مگر میں کسی کام سے اسلام آباد گیا بھی تو پنڈی جا کر بھائی سے ملنے کا تردد نہ کیا۔ ہاں' چھ ماہ پہلے جب انہیں فالج کا اٹیک ہوا تو میں ضرور عیادت کے لیے گیا تھا لیکن اس کے بعد فون کر کے بھی خیریت دریافت کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ ویسے اس کی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ سارے خاندان کی رپورٹیں پہنچانے کے لیے میری نصف بہتر کافی تھی۔ دنیا جہاں کے مرد گھر آنے کے بعد ٹی وی آن کرتے ہیں۔ بی بی سی' سی این این اور پرائیویٹ چینلز کے ذریعے حالات حاضرہ سے آگہی حاصل کرتے ہیں لیکن میں بدنصیب... میری قسمت میں آرزو تھی... جسے میں آن نہ بھی کرتا تو وہ مجھے دیکھتے ہی خود بخود آن بلکہ چالو

ہوجاتی اور سارے خاندان' دور پرے کے واقف کاروں' محلے داروں سے لے کر کام والی ماسی تک کے حالات زندگی کے تازہ ترین سانحوں اور تبدیلیوں سے مجھے باخبر کرتی ہے۔۔۔ بس نہ کہتی تھی تو اپنی نہ کہتی تھی۔۔۔ میری نہ سنتی تھی۔

"کبھی تو کسی دوسرے کے بارے میں بھی سوچ لیا کریں۔" اس نے ہاتھ نچایا۔

"پاء جی جب سے بیمار ہوئے ہیں ان کا سارا ٹبر کتنا پریشان رہتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی وہ دوسرے شہر رہتے ہیں' ساری برادری سے کٹ کر۔ ان کا کاروبار تو ان کے بڑے لڑکے ساجد نے سنبھال لیا ہے' حالانکہ وہ وچارہ تو خود ابھی "منڈا کھنڈا" (لڑکا بالا) ہے۔ ابھی اس کے یہ سب کرنے کے دن نہ تھے۔ باقی بچے پڑھنے لکھنے والے' باپ کی بیماری سے سہم سے گئے ہیں۔ ایک تو ہمارے جانے سے ویسے ہی انہیں اچھا لگے گا اور اگر ہم مل کے سیر کرنے جائیں گے تو ان کا جی اور بھی بہل جائے گا۔ پاء جی بھی خوش ہوں گے۔"

"اور تم اور بڑی بھابھی تو ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے "کیکلی" ڈالو گی۔ اللہ ملائی جوڑی۔"

"ہائے' اب میری عمر کیکلی" ڈالنے کی ہے۔ مجھے شوق نہیں کڑی بن بن کے دکھانے کا۔ ماشاءاللہ جوان بچوں کی ماں ہوں۔ پتر میرے "مونڈوں" (شانوں) برابر آگیا ہے۔ میں ان شوخیوں میں سے نہیں جو "چٹا جھاٹا تنے عقل وا گھاٹا" پہ عمل کرتے ہوئے "بڈھی گھوڑی لال لگام" بنی پھرتی ہیں۔"

"اوہو ماما! آپ دونوں کس بحث میں لگ گئے۔" میرے بیٹے نے اکتا کر کہا۔ البتہ بیٹی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"پاپا! آئی تھنک کہ ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم مری بے شک نہیں جاتے لیکن بڑے پاپا کے ہاں ضرور جانا چاہیے۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس سے وہ مجھے بہت بڑی بڑی' بہت سمجھ دار سی لگی۔

"شاید آرزو ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارے بچے اب بڑے ہوگئے ہیں۔" میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی گزشتہ دنوں کی سرگرمیوں پہ قدرے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جن کے ذریعے میں غزالہ درخشاں غزل سے تعلقات استوار کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ کبھی ڈنر پہ انوائٹ کر کے' کبھی بکس فیئر پہ چلنے کی دعوت دے کر تو کبھی کسی کافی ہاؤس میں بلا کر۔ اس سے خوبصورت گفتگو کے دوران میں نے ہمیشہ خود کو پچیس سالہ نوجوان محسوس کیا۔ ان بظاہر بے ضرر سی دوستانہ ملاقاتوں کو خوامخواہ ہی رومانی رنگ دے کر خود ہی اپنی تسکین کرتا رہا۔

"ہماری بیٹی کہتی ہے تو ضرور چلیں گے۔"

ایسا کہتے ہوئے میری اچٹتی ہوئی نظر آرزو پہ گئی تو مجھے اس کا چہرہ بجھتا ہوا محسوس ہوا لیکن میں نے اسے وہم سمجھ کے جھٹلا دیا۔

"وہ بھلا اتنی حساس کب سے ہونے لگی۔ اس کا موڈ اس بات پہ تو ہرگز خراب نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اہمیت نہ دوں۔ اسے ان باتوں کی پروا ہی کب ہے۔ ہاں' چاول اچھے نہیں نکلے' دم دینے کے باوجود نرم پڑ گئے۔ خربوزہ پھیکا نکلا' کالا زیرہ مزید مہنگا ہو گیا۔ آپاں صغراں نے پوتی کا رشتہ طے کرتے ہوئے اس سے مشورہ نہیں کیا۔ نئے ہمسائے بڑے روکھے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل پہ وہ بخوشی ہلکان ہو سکتی ہے۔

❁ ❁ ❁

"اجی' سنتے ہو!"

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ سر پہ مہندی کا لیپ کیے چپل گھسیٹتی میرے پیچھے ہی نکل آئی تھی۔

"آپ سے کچھ منگانا تھا۔" وہ دوپٹے کا پلو کھول کے کچھ نکالنے لگی۔

"تم چیز بتاؤ' پیسے رہنے دو۔ پہلے کبھی تم سے پیسے مانگ کر چیزیں لاتا ہوں۔"

"پیسے نہیں جی! یہ "لیریں" ہیں۔ ان کے رنگ کے دھاگے لادیں۔" اس نے چند دھجیاں سی پلو سے کھول کے میرے آگے لہرائیں۔ میرا خون کھول کے

رہ گیا۔

"پکے رنگ کے ہوں، اصلی پری کی نقلی لانا۔"

"اصلی پری یا نقلی پری۔۔۔ میں یہ خرافات نہیں لا سکتا۔ سبزی گوشت کے بعد اب تم مجھے سوئیاں دھاگے خریدنے کی طرف لگانا چاہتی ہو۔ آرزو بیگم! تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ میں ریحان علی فلک۔۔۔ یہ سب خریدوں گا۔۔۔ یہ درزیوں والا سامان۔"

"آپ ہر بار مجھے اپنا نام کیوں بتاتے ہو۔" اس نے دوبارہ پلو میں بڑی سی گرہ باندھ لی۔

"نہیں تے ناں سہی۔۔۔ میرے کوئی پیر نہیں ٹوٹے ہوئے، نکڑ کی دکان سے آپ جا کر لا سکتی ہوں۔ یہ تو مہندی تھپی ہوئی ہے، اس لیے آپ سے کہہ دیا۔ کوئی بات نہیں میں چادر کی بکل مار کے لے آؤں گی۔"

"ہاں جانا ضرور ہے۔ اتنا ضروری کام نہیں یہ دھاگے وغیرہ لانا۔ خبردار جو اس بے کار حلیے میں باہر نکلیں۔" میں نے ناپسندیدگی سے اس کے بالوں کو دیکھا، جن پہ تازہ گھلی گاڑھی گاڑھی بدرنگ اور بدبو دار مہندی کہیں کہیں سے ٹپک کے کانوں اور ماتھے تک آ رہی تھی۔ اور بال ایک بدوضع جوڑے میں لپٹے تھے۔ کل کا دھلا چہرہ تھکن کی کہانی کہہ رہا تھا۔ کھینچ کر بنائے بالوں کی وجہ سے اس کی چندھی چندھی آنکھیں بالکل منگولیہ نسل کی جنگجو شہزادیوں جیسی لگ رہی تھیں۔ جامن چوس چوس کر کھانے کی وجہ سے ہونٹوں پہ ان کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ کل والے جامنی اور زرد سوٹ کی شلوار تو وہی تھی، البتہ قمیص پہ کل رائتہ گر جانے کی وجہ سے تبدیل کرنے کی زحمت کر لی گئی تھی اور سبز رنگ کی اس ڈھیلی قمیص کے اوپر اس نے پرانا سا ایک گھسا ہوا تولیہ شانوں پہ ڈال رکھا تھا تاکہ مہندی قمیص پہ گر کے نشان نہ چھوڑ جائے۔

"توبہ!" اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "اچھا سنیں، یہ تو لیتے جائیں۔"

"اب یہ کیا بلا ہے؟" میں نے پلاسٹک کے اس ایئر ٹائٹ جار کو دیکھا۔

"یہ فالسے کا اچار ہے۔ وڈی آپاں کی نکی "نوں" (بہو) خیر سے دو جی کو ہے۔ کہہ رہی تھی۔ ماں جی! آپ کے ہاتھ کا اچار کھانے کو دل کر رہا ہے۔ خاص اس کے لیے بنایا ہے، ضرور دے کر آنا۔" اس نے میری بڑی بہن کا نام لیا۔

"ایک تو تمہارا یہ "سوشل ورک۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وہ جار تھام لیا ویسے بھی آج میں پہلی بار غزالہ کے گھر جا رہا تھا اور اس کے گھر یعنی ڈیفینس جاتے ہوئے راستے میں فردوس مارکیٹ تو آتی ہی تھی۔ جہاں آپا رہتی تھیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل تھا کہ آپا میری جان بخشنے میں کتنی دیر لگاتی ہیں۔ میں ان کے ہاتھ کم ہی آیا کرتا اور جب آ جاتا تو پھر اتنی جلدی وہ مجھے اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دیتی تھیں۔

"بعد میں جاؤں گا تو غزالہ کے ساتھ گزارے حسین لمحات کا سرور وہ بھک سے اڑا کے رکھ دیں گی۔ بہتر ہے، پہلے ہی اپنا خون جلا لوں بعد میں افاقہ تو ہونا ہی ہے۔"

یہ سوچ کر میں وہاں جانے سے پہلے ہی آپا کے ہاں پہنچ گیا۔ حسب توقع انہوں نے میرے لتے لینے میں دیر نہ لگائی۔

"آؤ آؤ بھائی! اے تابندہ۔۔۔ ذرا گھی تو لانا اصلی والا۔۔۔ میں اپنے پردیسی بھائی کے قدم رکھنے سے پہلے دہلیز میں ڈالوں۔۔۔ خیر سے آج چاند دن چڑھے کہاں سے نکل آیا۔"

ابھی میں شرمندہ ہونے کی ایکٹنگ کرنے ہی والا تھا کہ وہ بھولپن کی ایکٹنگ کے تمام ریکارڈ توڑنے لگیں۔

"ہائے ہائے کسی نے تمہیں میرے مرنے کی جھوٹی اطلاع تو نہیں دے دی جو تم بھاگے چلے آئے۔ جاؤ بھائی، اپنے کام دھندے پہ جاؤ۔ میں تو بھلی چنگی زندہ سلامت بیٹھی ہوں، خواہ مخواہ تمہیں چکر پڑا۔"

"کمال کرتی ہیں آپا۔" اب کے شرمندگی واقعی میرے اندر عود کر آئی۔

"یہ اچار آرزو نے بھیجا تھا۔" میں نے جار آگے کیا۔ آپا کے خفا خفا سے چہرے پہ ایکدم ٹھنڈی میٹھی

مسکراہٹ سکون سے پھیل گئی۔ میں سوچنے لگا یہ اچار سے ان کا دلی لگاؤ ہے یا آرزو کے نام کا اعجاز' جواب انہوں نے خود دے دیا۔

"جیتی رہے ہماری بھرجائی۔" ان کی آواز گلوگیر ہوئی۔ "یہ کام تو آرزو ہی کر سکتی تھی۔ یہ اس کی ہی محبت ہے کتنا خیال ہے اسے اس بہن کے جذبات کا۔"

"اب ایسا بھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اس نے' خود جی بھر کے چٹوری ہے۔ سارا سال ہی چٹنیاں' اچار' مربّے' مرتبان بھر بھر کے ڈالتی ہے۔ یہ پاؤ بھر کا آپ کے لیے بھیج کے ایسا کیا تیر مار ڈالا اس نے۔"

"بات اچار کی نہیں ہے ریحان' ارے جھلّے! یہ اچار تو نرا بہانا ہے۔ پرسوں ہی فون پہ اس سے بات ہوئی۔ تیرے لیے بڑی اداس تھی میں اور آرزو..... وہ تو دلوں میں اترنے کا فن جانتی ہے۔"

"اچھا آ..... آ....." میں نے حیرت سے اس انکشاف پہ نعرہ بلند کیا۔

"اور گیا..... دیکھ..... اس اچار کے بہانے تجھے یہاں بھیج دیا۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ تجھے کیا پتا' ماں جائے کا سایہ بھی نظر آئے تو بہنوں کو کتنا سکھ ملتا ہے۔ اک سات سمندر پار بیٹھا ہے' دو جا پنڈی جا بسا' لیکن سچ کہتی ہوں' وہ اتنے دور نہیں لگتے۔ جتنا تو لگتا ہے۔ ایک شہر میں رہ کر بھی تو نے خود کو کتنا الگ کر لیا ہے۔"

"بس آپا..... مصروفیت۔"

"رہنے دے' رہنے دے..... وہ جو دوسرے ملک سے مہینے بعد فون کرتا ہے۔ پانچ سات منٹ کی کال میں اتنا دل ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اور تو..... جا رے ریحان! تجھے تو نہ رشتے نبھانے آئے نہ محبت جتانی آئی۔" وہ دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔ ان کی بہو تابندہ میرے لئے شربت لے آئی۔ میرا قطعی موڈ نہ تھا۔ کچھ دیر اور بیٹھ کے یہ شربت پینے کا۔ بلکہ میرا ارادہ تو کھڑے کھڑے سلام کر کے اچار تھما کے واپس جانے کا تھا لیکن اس جذباتی اور ڈرامائی صورتحال سے اس طرح غائب ہو جانے کا مطلب تھا اس ڈرامے کے دور لمبے کو مزید طویل کرنا۔

"پتا نہیں تیری کون سی نیکی اللہ کو پسند آگئی یا اللہ بخشے اماں جی' ابا جی کی دعائیں کام آئیں۔ جو تیرے نصیب میں آرزو جیسی گھر جوڑنے والی عورت آئی۔ یہ اس کے کرم ہیں جو تو خاندان سے جڑا بیٹھا ہے ورنہ تیرے کرتوت ایسے نہیں تھے جو کوئی تیرے ساتھ تعلقات برقرار رکھ پاتا۔ اوروں کے بھی کام دھندے ہوتے ہیں لیکن ایک آواز پہ سارے بہن بھائی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹتے ہیں اور تو..... نہ کسی کی خوشی میں شریک..... نہ غمی میں شریک۔ تیری کسر بھی آرزو پوری کر دیتی ہے۔ کہیں کوئی بیمار ہو' وہ سب سے پہلے پہنچے گی۔ کسی کا بچہ پاس ہو۔ سب سے پہلے مٹھائی لے کر وہ آئے گی۔ کسی کے گھر شادی ہو' آدھے کام وہ سنبھالے گی۔ تیری تو دنیا بنا دی اس نے۔"

ہمیشہ کی طرح آج بھی میں ان کی زبانی "آرزو نامہ" سن کر اوب گیا۔ سر جھٹکتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا آپا! میرا خیال ہے' میرے آنے سے آپ کو مایوسی ہوئی ہے۔ آرزو کو ہی آنا چاہیے تھا۔ شاید آپ بھی خوش ہوتیں۔ چلتا ہوں۔" وہ تاسف بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کی بہو فوراً" کچن سے نکلی۔

"ماموں جانی! چائے پی کے جائیے گا۔"

"پھر کبھی سہی۔" میں ٹالتا ہوا راہداری کی جانب مڑ گیا۔ پیچھے سے تابندہ کا حیران سا تبصرہ سنائی دیا۔

"ممانی کتنی محبت کرنے والی' کتنی پرخلوص سی ہیں۔ ماموں جیسے روکھے پھیکے اور خشک مزاج انسان سے کیسے گزارا ہو جاتا ہے ان کا۔"

اس سوال پہ میں تڑپ ہی تو گیا۔ سخت ناانصافی تھی یہ' بجائے اس کے کہ مجھ سے ہمدردی جتائی جاتی کہ میں اس کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں' الٹا ممانی صاحبہ پہ ہمدردی کی بالٹیاں بھر بھر انڈیلی جا رہی تھیں۔ لاشعوری طور پر میں آپا کا جواب سننے کے لیے رک

گیا۔

"بس تابندہ! مقدروں کے کھیل' رب سوہنا جانے کس کام میں اس کی کیا مصلحت ہے۔ میں ابھی اپنے ویر کے اچھے نصیبوں کا شکر ادا کر رہی تھی' شاید اس جوڑی ملانے کے پیچھے اللہ کی یہی مرضی ہو کہ اس ناشکرے انسان کی زندگی آرزو جیسی عورت کی وجہ سے سنور جائے لیکن آرزو.... اس بھلی عورت کو کیا ملا...."

"ہم سب لوگوں کی محبت امی جان.... اور کیا.... کیا کوئی نند بھاوج کے لیے ایسے جذبات رکھ سکتی ہے جیسے آپ کے ہیں۔ اگر ممانی جان کو اتنی محبت ملی ہے تو یہ بھی ایک طرح سے ان کے خلوص اور بے لوث محبت کا صلہ...."

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں فوراً" باہر نکل گیا۔

❁ ❁ ❁

ڈیفنس کے Y بلاک کا سب سے عالیشان بنگلہ غزالہ کا تھا۔ مجھے اپنی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی اس کے بڑے سے منقش عالیشان آہنی گیٹ سے اندر لے جاتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ پورٹیکو میں مرسڈیز' ہنڈا اکارڈ اور مزدا ہائٹ چم چم کرتی لشکارے مار رہی تھیں' لش گرین لان میں سنگ مرمر کے بنے بینچ' چیئرز اور شیڈ لگے تھے۔ مصنوعی آبشار بھی تھی میں مرعوب ہوتا اندر داخل ہوا۔ آراستہ و پیراستہ کوریڈور سے لے جاتے ہوئے ملازم نے مجھے ایک سجے سجائے لاؤنج میں لا بٹھایا۔ میں ایک بیش قیمت دبیز صوفے میں دھنسا سامنے کی دیوار میں نصب ساٹھ انچ کی اسکرین پہ انڈیا پاکستان کا میچ دیکھ رہا تھا۔ جب آغا غفور کی آمد ہوئی۔ وہ ایک پستہ قامت' فربہ اندام اور تقریباً" گنجا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ یقیناً" مجھ سے بھی دس بارہ سال پہلے کی پیداوار.... اس کی توند میری منی سی توند کے مقابلے میں اتنی ہی وسیع تھی جتنی اس کی مالی حیثیت میری مخدوش حالت سے بڑھ کے تھی۔ وہ مسکرایا تو اس کے کتھے اور چونے سے سبز پڑتے گلے سڑے دانت اور پیلے مسوڑھے دیکھ کر مجھے ابکائی سی آگئی۔

"تشریف رکھیے۔" اس کی آواز اس کے حلیے سے قطعی مطابقت نہ رکھتی تھی' منحنی سی' منمناتی ہوئی کسی خوفزدہ نوزائیدہ سہمنے جیسی۔

"غزالہ آپ کا بڑا ذکر کرتی ہے۔"

"جی بس' ذرہ نوازی ہے ان کی۔"

"سنا ہے آپ بھی شاعر مائر ہو' کتاب و تاب لکھتے ہو۔" اس سوال پہ میں کان کھجا کے رہ گیا۔

"اپنی غزالہ کو بھی بڑا چسکہ ہے کتاب و تاب لکھنے کا' میں نے کہا۔ میرا دھن دولت کس کام کا.... جو تیرا شوق پورا نہ کر سکے۔ جا لکھ' جو لکھنا ہے لکھ لے۔ میں چھپواؤں گا۔ سالا کوئی نہ خریدے تو ساری کتابیں بھی میں کھود کھرید لوں گا۔"

"جی جی.... بتاتی ہے وہ کہ آپ بہت محبت کرتے ہیں اس سے۔" وہ یوں شرمایا جیسے سولہ سالہ دوشیزہ کی پوشیدہ محبت کا بھانڈا کسی سکھی سہیلی نے سرعام پھوڑ ڈالا ہو۔

"ویسے غزالہ صاحبہ ہیں کہاں؟" بہت محتاط ہو کر میں نے سوال کیا۔ بے شک وہ شوہروں کی اس قسم میں سے نہیں تھا جو بلاوجہ غیرت کھا بیٹھتے ہیں۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

"سو رہی تھی' رشیداں کو بول کے تو آیا میں' کہ میڈم کو جگا دو' بولو کہ مہمان آیا ہے۔ لیکن سالی وہ بھی ڈرتی ہے میری طرح کہ میڈم سر ہی نہ پھاڑ دے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ ابھی اس کے قہقہے کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی ایک ہیبت ناک واویلا۔

"ذرا سکون نہیں اس گھر میں۔ ہزار بار کہا ہے مجھے کچی نیند سے جگانے کی جرأت مت کیا کرو۔" سیڑھیوں سے کچھ لڑھکنے کی آواز آئی' شاید کوئی گلاس' مگ وغیرہ تھا۔

"بی بی! صاب نے بولا تھا۔" ملازمہ کی سہمی ہوئی

آواز پہ میرے سامنے بیٹھے آغا غفور کی سیاہ رنگت ایکدم نیالی پڑ گئی۔ اس کے جامنی ہونٹ زرد ہو گئے۔ لاؤنج کا پردہ ہٹا اور ایک بکھرے بالوں والی غضب ناک عورت پھنکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"کیا تکلیف تھی تمہیں غفور کے بچے، کتنی بار کہا ہے چھٹی کا یہ دن سکون سے گزار لیا کرو۔ کہیں باہر دفع ہو جایا کرو۔ سارا دن میرا خون جلانے گھر میں دندناتے پھرتے ہو۔" وہ مٹھیاں بھینچے اس پہ چلا رہی تھی۔

"گجالہ۔۔۔ گجالہ ۔۔۔ میری جان۔۔۔ تم بھول گئیں۔۔۔ تم نے آج پھلک صاب کو گھر بلایا تھا۔ اچھا تو نہیں لگتا، مہمان بیٹھا ہے اور میزبان گائب۔" اس نے ڈر کے پاؤں تک سمیٹ کے صوفے پر کر لیے۔

تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ روکھے بکھرے بالوں والی، پھیکی رنگت پہ بدنما جھائیوں والی، سوجی ہوئی بے کشش گدلائی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں والی اور کرخت آواز میں انتہائی بھونڈے طریقے سے چلاتی ہوئی یہ عورت غزالہ درخشاں غزل ہے۔

وہ غزالہ جس کی ہر ہر ادا میں غزل کا سا بانکپن ہے۔ جس کی لوچ دار آواز میں گیتوں کا ترنم۔۔۔ جس کے خوابناک لہجے میں نظم کی سی نزاکت۔۔۔ جس کے ابروؤں کی خفیف سی جنبش بھی ہزار فسانے کہہ ڈالتی تھی۔ اس کے وہی ابرو اس وقت آنکھوں سمیت ماتھے سے بھی اوپر جا لگے تھے۔ وہ جس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ شاعرانہ تخیل کی مکین لگا کرتی تھی، اس وقت شعلے برسا رہی تھی۔ اس نے رخ موڑ کے مجھے دیکھا۔ اچانک اس کے چہرے پر زبردست تغیر پیدا ہوا اور وہ "ایکسکیوز می" کہتی واپس مڑ گئی۔ آغا غفور نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت پیش کی۔

"اپنی گجالہ گسّے کی ذرا تیج ہے۔ آئے گئے کا بھی لحاج نہیں کرتی۔"

"میرا خیال ہے، مجھے چلنا چاہیے، شاید غزالہ صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" مجھے خاصا برا محسوس ہوا کہ وہ مجھ پہ توجہ دیے بغیر واپس لوٹ گئی۔

"نہیں پھلک صاب، بیٹھو یار، اصل میں گجالہ نے آپ کو دیکھا نہیں، سویرے سویرے اس نے آنکھوں میں وہ نہیں لگائے ناں۔۔۔ وہ کیا بولتے ہیں آپ لوگ اسے۔۔۔ ہاں ۔۔۔"

"اوہ لینس۔۔۔ تو غزالہ لینسز بھی لگاتی ہیں۔"

"ہاں پہلے تو چشمہ وشمہ لگاتی تھی۔ پر اب کہاں ہے ان چشموں کا۔ سالی ناک بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔"

"مام کہاں ہے۔؟" اس آواز پہ میں نے چونک کے سامنے دیکھا۔ جاناں سے سال بھر ہی بڑی ایک لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ براؤن تراشیدہ بال ہیئر بینڈ میں جکڑے ہوئے۔ نو عمر چہرے پہ میک اپ کی آمیزش نے کچھ پکا پن پیدا کر دیا تھا، گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ختم ہوتا وائٹ اسکن ٹائٹ ٹراؤزر۔۔۔ پنڈلیوں پہ بنے ٹاٹو۔۔۔ ہائی ہیل سینڈل جسم سے چپکی شرٹ جس سے شانے اور گردن کا خاصا حصہ نمایاں ہو رہا تھا، اس چودہ پندرہ سالہ بچی کا یہ بے باک حلیہ دیکھ کر مجھے خفت نے آن گھیرا، مجھے یوں بے چینی سی ہونے لگی جیسے خدانخواستہ میری جاناں۔۔۔ حالانکہ کتنی کم عمری میں ہی آرزو نے اس کے فراک اسکرٹ وغیرہ چھڑوا دیے تھے۔ کبھی کبھار وہ جینز پہن لیا کرتی، مگر ڈھیلی ڈھالی لمبی سی ٹی شرٹ اور اسکارف کے ساتھ۔۔۔ وہ بھی گھر کے اندر۔۔۔ باہر جاتے ہوئے سلیقے سے دوپٹہ شانوں پہ پھیلانا اس نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی سیکھ لیا تھا۔ جب کہ آغا غفور اطمینان سے ریموٹ ہاتھ میں لیے چینل چینج کر رہا تھا۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں انکل! ویر از مائی مام۔۔۔" وہ بالکل غزالہ کے سے انداز میں چلائی۔

"ارے بے بی، تم کو مالوم ہے، وہ اتنی سویرے کدھر جائے گی۔ ہوگی اندر اپنے کمرے ومرے میں۔"

"اوکے، انہیں بتا دیں۔ میں اپنے فرینڈ کے ساتھ آؤٹنگ پہ جا رہی ہوں۔ لیٹ آؤں گی۔" وہ چیونگم چباتی۔۔۔ بغیر کسی سلام دعا کے تکلف میں پڑے باہر

نکل گئی۔ میں نے تعارف جاننا چاہا۔
"بیٹی ہے ہماری۔" وہ اپنے گلے سڑے دانت دکھاتے ہوئے مسکرایا۔
"لیکن وہ تو آپ کو انکل۔۔۔"
"ہاں بچی ہے ناں۔۔۔ ابھی دل سے میرے کو پاپا نہیں مانا۔۔۔ یہ اصل میں گجالہ کے پہلے والے ہسبینڈ سے۔۔۔"
"اوہ۔۔۔ آئی سی۔۔۔" اس کا ذکر غزالہ نے اب تک مجھ سے نہیں کیا تھا کہ دو شوہروں کے ساتھ ساتھ وہ ماضی میں ان کے حوالے سے حاصل کی گئی یادگاریں بھی رکھتی ہے۔ میں نے گردن گھما کے باہر لان میں دیکھا' وہ ایک ادھیڑ نما لڑکے سے بے تکلفی سے گلے مل رہی تھی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھل کے اس کی ہیوی بائیک پہ سوار ہوئی اور تقریباً" چپک کے بیٹھ گئی۔ میں نے آغا غفور کا ردعمل جانچنا چاہا۔ وہ اسی اطمینان کے ساتھ پان چبا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی دل سے خود کو اس بچی کا پاپا نہیں مانا تھا۔

"اوہ آئم ریئلی ویری سوری فلک جی!" غزالہ ایک بار پھر موجود تھی اپنے اسی سدا بہار رنگ روپ اور پُرتکلف مرصع لب ولہجے سمیت۔ نجانے اسے کون سا منتر آتا تھا کہ دس پندرہ منٹ میں اس نے اپنی کایا پلٹ دی تھی۔ گدلی آنکھوں پہ وہی نیلگوں لینس سجے تھے۔ پلکیں بھی دراز ہو چکی تھیں' جھائیاں' حلقے سب غائب۔۔۔"
"ایکچوئلی رات کو ایک لیٹ نائٹ فنکشن کی وجہ سے سونے میں دیر ہو گئی۔ آپ نے کچھ لیا فلک جی۔۔۔" اچانک پینترا بدل کے وہ اپنے سرتاج سے مخاطب ہوئی۔
"غفور! صرف باتیں ہی بگھاریں یا مہمان کو چائے وغیرہ بھی پوچھی۔ ویسے تم سے امید تو نہیں۔۔۔"
"ٹھنڈا منڈا تو پلا دیا۔ چائے کہ اس لیے نہیں بولا کہ تم نے تو پھلک صاحب کو دوپہر کے کھانے پہ بلا رکھا ہے۔"
"رہے ناں تم وہی اجڈ کے اجڈ' یعنی اگر کسی کو لنچ پہ انوائیٹ کیا جائے تو چائے کا تکلف اضافی ہوتا ہے۔"
"پلیز' غزالہ۔۔۔" عزت افزائی آغا صاحب کی ہو رہی تھی' چہرہ میرا سرخ پڑ گیا۔ میں نے اسے مزید گل افشانی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔
"جاؤ دیکھو' کچن میں کیا ہو رہا ہے۔ رات کو میں نے جو جو کہا تھا' ٹھیک وہی کچھ بن رہا ہے یا نہیں۔" اس نے نخوت سے اپنے سرتاج کو وہاں سے چلتا کیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی غزالہ نے "ہونہہ" کہہ کر زور سے سر جھٹکا۔ لمحہ بھر کی دیر تھی' اس کی ناگوار تیوریاں پھر سے غائب ہو گئیں' چہرے پہ میٹھی مسکان اور لہجے میں شیرینی پھر سے گھل گئی۔
"تو یہ ہے تمہاری انڈر اسٹینڈنگ" میں نے کریدا۔
"ہاں شکر ہے اللہ کا' گزارا ہو رہا ہے۔" اس نے صبر و قناعت کی دیوی بننے کا مظاہرہ کیا۔
"کون کہتا ہے کہ آج کی عورت سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ یہ سمجھوتہ نہیں تو اور کیا ہے' ہاں آج کی عورت خود کو کچل کے نہیں رہ سکتی۔ اخلاق کے ساتھ رہنا خود کو پل پل مارنے کے مترادف تھا۔ کوئی ایک بات ایسی نہیں تھی جس پہ وہ مجھ سے متفق ہوتا۔ کمرے کی کلر اسکیم' باتھ روم میں رکھا شیمپو' ناشتے میں کھائے جانے والے جیم کا برانڈ۔۔۔ اف ہر معاملے میں اپنی پسند ناپسند تھوپنا اس پہ فرض تھا۔ اگر اسے اورنج مارملیڈ پسند نہیں تو کیا وہ میری خاطر کھا نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھے اسکائی بلیو کلر سے نفرت ہے تو کیا وہ اس کلر کی شرٹس پہننا ترک نہیں کر سکتا تھا۔ سب ہی کچھ میں کیوں کرتی۔ آخر کب تک اپنا دل جلاتی۔ اسے ہر ہفتے اسکائی بلیو شرٹ باقاعدگی سے پہنے دیکھ کر کڑھتی رہتی۔
فرائی انڈہ سے سخت چڑ ہے مجھے اور وہ میرے سامنے بیٹھ کر۔۔۔ میری فیلنگز کی رتی برابر پروا کیے بغیر دو دو فرائی انڈے کھا جاتا تھا۔۔۔ سوچو کتنا مشکل تھا میرے لیے اس کے ساتھ رہنا۔ اور وہ سیٹھ باتلی والا۔۔۔ اس کا اپنا نفسیاتی مسئلہ تھا۔ اسے بیوی چاہیے

تھی۔ 'بیمکل سیٹھانی' ہر سال ایک بچہ پیدا کرنے والی۔۔۔ دن بھر گھرداری میں الجھی رہنے والی' شام بن ٹھن کر سیروں سونا لاد کر اس کے ساتھ پارٹیز میں جا کر بکھارنے والی۔ میں نے اس کے لیے یہاں تک کیا کہ ڈھائی سالوں میں دو بیٹے تک پیدا کیے۔ لیکن جی! میں اس کی پسند کے بھاری بھاری زیورات نہیں پہن سکتی تھی۔ دوسرا وہ میری شاعری کا 'میری صلاحیتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ میرے فن کی قدر نہیں تھی اسے' اس لیے میں نے الگ ہو جانا مناسب سمجھا۔ وہ اولاد جمع کرنے کا شوقین' اس نے بیٹے اپنے پاس رکھ لیے' سب سمجھتے تھے کہ میں گھر بسانے والی عورت ہی نہیں' حتیٰ کہ میرے اپنے ماں باپ بھی' آپ بتائیے فلک جی! کیا میں ایسی ہوں؟" اس نے اتنے مان سے سوال کیا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے نفی میں سرہلا دیا۔

"اب آغا غفور کے ساتھ بھی تو گزارا کر رہی ہوں۔ بھئی جہاں تک چھوٹے موٹے سمجھوتوں کا تعلق ہے ان سے میں نہیں گھبراتی۔ آخر ہوں تو ایک مشرقی لڑکی اپنی تمام تر روشن خیالی اور آزادی پسند فطرت کے باوجود۔" اگر کچھ دیر قبل میں اس کا بغیر میک اپ کا چہرہ نہ دیکھ چکا ہوتا تو شاید اس کا خود کو لڑکی کہنا آسانی سے ہضم کر جاتا لیکن اس وقت اس کا یہ دعوا میرے حلق میں اٹک گیا۔

"آغا غفور کی کتنی باتیں ہیں جنہیں میں دل پہ پتھر رکھ کے جھیل رہی ہوں' آپ ہی بتائیے فلک جی! کیا آج کی عورت کا یہی مقدر ہے کہ وہ اپنے اوپر صرف باوفا اور صابر ہونے کا ٹیگ لگوائے رکھنے کے لیے صبر سے سب کچھ برداشت کرتی جائے۔"

"گجالہ! ٹیبل لگ گئی ہے' مہمان کو کھانے پہ لے آؤ۔" اچانک آغا غفور اپنی قدرتی ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ یہ پیغام لیے حاضر ہوا۔ "غزالہ اپنے زرّین فرمودات اس حد تک میرے اندر ٹھونس چکی تھی کہ اب مزید کچھ کھانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ایک اچھے مہمان کی طرح میں غزالہ کی سنگت میں ڈائننگ ہال

موٹاپے سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے' موٹاپا اور پیٹ کا بڑھ جانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اسی طرح چہرے پر مہاسے' کیل' چھائیاں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔ خواتین کے ان تمام مسائل کا حل
نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ
جوھر ھاضم
- موٹاپا ختم
- بڑھا ہوا پیٹ اندر
- داغ دھبے اور کیل مہاسے غائب
- گیس' معدے کی گرانی کا خاتمہ
- قیمت صرف /50 روپے
پتہ ذیل سے منگوائیں۔
شوٹائم۔ A/2۔ بیت الغزفان بگہ ریسٹورنٹ کے برابر مین یونیورسٹی روڈ۔ گلشن اقبال۔ کراچی۔

تک چلا آیا جو واقعی ایک "ہال" ہی تھا۔
اٹھارہ کرسیوں والی وہ گلاس ٹاپ' براس میڈ ڈائننگ ٹیبل انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی تھی۔ بلکہ اٹی پڑی تھی۔ ایک نظر ڈال کر ہی میرا تو دل گھبرا سا گیا۔ تین چائنیز' دو اٹالین اور کم از کم چھ روایتی پُر تکلف دیسی ڈشز کے علاوہ بازار سے منگائے آئٹم بھی صاف پہچانے جا رہے تھے۔ مثلاً مٹن تکہ' چکن کباب اور پلاؤ۔۔۔ اپنی نشست سنبھالتے ہوئے میں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ آغا غفور اپنی پلیٹ ہاتھ میں تھامے غزالہ کے روبرو مؤدبانہ کھڑا تھا۔ جو کلف زدہ نیپکن کھول کر اپنے آگے پھیلا رہی تھی۔ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ جب اس نے اپنے شوہر کی پیش کردہ پلیٹ تھامی تو مجھے میاں بیوی کی اس محبت پہ رشک سا ہوا۔۔۔ واقعی کیا آئیڈیل شوہر تھا۔ (کم از کم ایک بیوی کی نظر میں) جو خود بڑھ کے پلیٹ پیش کر رہا تھا۔
"لاؤ بھئی' پہلے تمہارا کھانا ڈال دوں۔" غزالہ کے کہنے پہ مجھے مزید رشک محسوس ہوا۔ یعنی اس میں بھی مشرقی بیویوں والی ادائیں پائی جاتی ہیں' خود کچھ کھانے سے پہلے شوہر کی پلیٹ بھرنا' میں دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ غزالہ نے پلیٹ کے ایک کونے میں فریش سلاد' کچھ رائتہ رکھا۔ چمچی بھر پاستا ڈالا۔ مٹن تکے میں سے ایک لاغر سی چانپ منتخب کی۔ اور باقی ماندہ جگہ کو ماش کی دال سے بھر دیا۔
"گجالہ! تھوڑے سے چاول بھی۔۔۔" وہ گھگھیایا۔
"توند دیکھی ہے اپنی۔" وہ پھنکاری۔ "وزن تو ایسے بڑھتا جا رہا ہے جیسے عدنان سمیع سے شرط لگا رکھی ہو' نہ چاول' نہ کباب' نہ سویٹ ڈش۔۔۔"
وہ چپ چاپ اپنی پلیٹ لیے ڈائننگ ہال سے نکل گیا۔
"یہ آغا صاحب کہاں چلے گئے' کیا وہ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے؟"
"آغا صاحب کو نہ صرف شوگر ہے بلکہ کولیسٹرول لیول بھی لاسٹ لمٹ کراس کر رہا ہے۔ یہاں بیٹھے تو ندیدی نظروں سے ہر چیز کو تکتے رہیں گے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔
"نہ آپ کو کچھ ہضم ہو گا نہ مجھے۔ ویسے بھی فلک جی! میں ٹھہری نفاست پسند شاعرہ' آپ تصور نہیں کر سکتے' اسے اپنے سامنے کھانا کھاتے دیکھ کر میری نفیس طبع پہ کیا ستم ٹوٹتے ہیں۔۔۔ اس کی "چپ چپ۔۔۔" کر کے چبانے کی آواز۔۔۔ اونو۔۔۔ ہو ریبل" اس نے کراہیت سے منہ بنایا تو میں تھرا اٹھا۔
اچانک مجھے کئی سال پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ حالات ذرا بہتر ہوتے ہی میں نے تب آرزو کو ایک کل وقتی ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ کے دی تھی۔ جب دونوں اوپر تلے کے بچے چھوٹے تھے۔ ماسی شنو کو جب پہلے دن آرزو نے آواز دے کر کھانے پہ بلایا تو میں نے خاص نوٹس نہ لیا' لیکن جب وہ میرے سامنے ہی فرش پہ پھسکڑا مار کے بیٹھی' ہاتھ میں روٹی رکھ کے' روٹی پہ سالن ڈال کے۔۔۔ شڑوں شڑوں اور چپڑ چپڑ کی آوازوں کے ساتھ کھانا کھانے لگی تو مجھے سخت ناگواری محسوس ہوئی۔ کھانے کے بعد میں نے سخت الفاظ میں آرزو کو تنبیہہ کی۔
"آئندہ سے ماسی کو کچن میں کھانا دے دیا کرو۔"
"سارا دن تو گرمی میں کام کرتی ہے۔ روٹی بھی گرمی میں بیٹھ کے کھائے گی تو کیا سواد آئے گا وچاری کو۔ ادھر پنکھے کے نیچے بیٹھ کے کھاتی آپ کا کیا لیتی ہے۔"
"گھر میں اور بھی پنکھے لگے ہیں' کہیں بھی بٹھا دو۔ مگر یہاں نہیں۔ بچے کیا سیکھیں گے' کل کو وہ بھی اسی طرح بد تہذیبی سے کھائیں گے۔"
"خوامخواہ میں۔۔۔ وہ آپ کے بچے ہیں' جو آپ سکھاؤ گے وہی سیکھیں گے۔ ماسی وچاری کا کیا قصور' ہر بندہ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے اور وہ تو سیکھنے کی عمر سے بہت آگے نکل آئی ہے' نہ ریحان صاحب! بڑے بول نہ بولو' اللہ کو تکبر پسند نہیں۔ پتا نہیں میں ماسی کو یہ بات بولوں تو اس کا کتنا دل دکھے۔۔۔ ناں جی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے' میرا ہنستا بستا گھر۔۔۔ میں کس لیے

کسی غریب کا دل دکھا کر "ہائے" لوں۔ اللہ معاف کرے جی۔۔۔ مجھے بھی اور آپ کو بھی۔"

اور اس وقت میرے سامنے بیٹھی وہ عورت۔۔۔ جس کا موازنہ کبھی اپنی بیوی جیسی ایورتج عورت سے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا' کسی ملازم کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے شریک حیات کے ساتھ ایسا سلوک کر رہی تھی جو کسی بھی طرح انسانی نہیں کہلایا جاسکتا تھا۔ میرا جی کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔

"آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے فلک جی' پلیز کچھ اور لیجئے ناں' ایسا کرتے ہیں' چائے ہم اسٹڈی میں منگوا لیتے ہیں۔ ساتھ میں ایک بھرپور ادبی گفتگو ہو جائے تو کیا ہی کہنے' آپ جیسے انسان کی صحبت روز روز تو میسر نہیں آتی۔"

لیکن اب مجھے اس کی مزید صحبت کی خواہش رہی تھی نہ ہی اس کی ذہانت سے بھرپور خوبصورت گفتگو سے لطف اندوز ہونے کی۔ میں جلد ہی معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

❄ ❄ ❄

"آگئے خیر سے۔" وہ آج بھی خربوزوں سے دل بہلا رہی تھی۔ ایک نظر میرا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں روٹی گرم کرتی ہوں۔"

"تمہیں پتا تو ہے کہ میں کھانے کی دعوت سے ہی آرہا ہوں۔"

"رجے پیٹ والوں کی شکل پہ ایسے بارہ نہیں بجے ہوتے۔" وہ ہاتھ اور سر دونوں جھٹکتی میرے دعوے کو جھٹلا گئی۔ اور میں پہلے کی طرح اس کے درست اندازے پہ پیچ و تاب نہ کھا سکا۔ چند ہی منٹ بعد ٹرے میرے سامنے تھی۔ آلو کا پراٹھا' لسوڑھے کا اچار' زیرے والا رائتہ اور کالی مرچ والا کھیرا' میں کافی دنوں سے آلو کے پراٹھے کی فرمائش کر رہا تھا جسے آرزو کمال بے اعتنائی سے درگزر کرتی آرہی تھی اور آج جب کہ میں کھانے پہ موجود نہیں تھا۔ میری پسندیدہ چیز بنی تھی۔ اس ناانصافی پہ میں آواز بلند کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"لو' اتنے دنوں سے تو کھانس کھانس کے کان لے لیے ہیں آپ نے۔ ایک تو آلو ویسے ہی بلغمی کھانسی میں نقصان کرتے ہیں' دوسرا آپ اچار بغیر پراٹھا لیتے نہیں۔ میرا کیا دماغ خراب تھا' ساری رات آپ کھانستے' میں جاگتی رہتی' مفت کا سیاپا۔"

میں مسکرایا تو وہ حیرت زدہ سی میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

"میں نے کہا۔ اجی! سنتے ہو؟"

"سن رہا ہوں۔" میں نے خستہ لذیذ پراٹھے کے لقمے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"بڑے اچھے موڈ میں لگ رہے ہو جی' لگتا ہے' وہاں خوب مزا آیا۔ بڑے بڑے لوگ ہوں گے' بڑی بڑی باتیں ہوں گی ان کی۔"

"ہاں لوگ تو بڑے تھے۔۔۔ مگر باتیں۔۔۔ میں بڑبڑا کے رہ گیا۔ میری خود کلامی کو نہ سمجھتے ہوئے وہ برتن اٹھا کے کچن کی طرف مڑنے لگی۔

"آرزو! میں نے کہا' سنتی ہو۔؟"

"ہیں جی؟" وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی۔

"اس ویک اینڈ پہ پروگرام بنا ہی ڈالو پنڈی جانے کا۔ بھائی جان کو فون کر کے بتا دینا تاکہ وہاں بچے پہلے سے تیاری کر کے رکھیں مری جانے کی۔"

"ہائے سچی' کتنا سواد آئے گا' کتنا شغل لگے گا' ہائے میں مرجاواں۔۔۔ پہلے جاناں کو تو یہ خبر سناؤں۔"

اس کے چہرے پہ اس معمولی سی خبر سے یک بیک اتنی خوشیاں اور رنگ بکھر گئے کہ زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا' خوشی کے اس سچے اور بے ساختہ رنگ کے آگے ساری شاعرانہ نزاکتیں سب تخیلاتی لطافتیں۔۔۔ ہیچ ہیں۔۔۔ سراب ہیں۔

❄